باتیں دُنیا اور دل کی

سلمیٰ اعوان

الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

امریکہ کے نئے بغل بچے داعش کے خودساختہ ابوبکر البغدادی کے نام
جو اکیسویں صدی کا نیا لارنس آف عریبیا بننے جا رہا ہے۔

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

میرے کالم

2011 سے 2014 تک

لمحہ فکریہ

شام کی صورتِ حال۔ایک پہلو یہ بھی ہے

salma.awan@hotmail.com

ہیلری کلنٹن کا نیا بیان ملاحظہ کیجئے۔

ہم شام کے صدر بشارالاسد کو تنہا کر دیں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ امریکہ اب پاگل اور باؤلے کتے کا روپ دھار گیا ہے۔دلدلوں میں دھنستا چلا جا رہا ہے مگر باز نہیں آ رہا۔اجڈ افغانیوں نے ناک چنے چبوا دیئے ہیں۔نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔عراق میں شیعہ سُنی اختلافات کو ہوا دے کر خانہ جنگی کی سی صورت پیدا کر رکھی ہے۔

آئے دن بموں کے پھٹاؤ،غریبوں کی اموات،املاک کی تباہی اور معیشت کی بربادی نے جس طرح عراق کا بیڑہ غرق کیا ہے اس کی سنگینی کا احساس وہاں جا کر ہوتا ہے۔یہاں بیٹھ کر صورت حال کا صفر فی صد بھی پتہ نہیں چلتا۔ایران بھی نشانے پر رکھا ہوا ہے۔اُسے آئے دن دھمکیاں دینے سے باز نہیں آتا۔

بشارالاسد کا جُرم کیا ہے؟اس کا سب سے بڑا جرم تو عراق کی جنگ میں امریکہ کی مذمت میں دوٹوک موقف تھا۔اُس نے واضح انداز میں نہ صرف حمایت سے انکار کیا بلکہ غُصے کا اظہار بھی کیا۔ساتھ میں اِس پر بھی لعن طعن کی کہ خلیجی جنگ میں عراق پر عائد اقتصادی پابندیاں خصوصاً دواؤں کی فراہمی پر پابندی انسانیت سوز فعل تھا۔امریکہ معصوم بچوں،عورتوں اور بوڑھوں کا قاتل ہے۔شام نے زمینی راستے سے دوائیوں کی فراہمی کی ہر کوشش کو جتنا ممکن تھا آسان بنایا۔

اِس ظلم نے جس طرح عراقی نسلوں کی تباہی کی وہ نا قابل معافی ہے۔

گزشتہ سال جولائی میں مَیں نے شام کا سفر کیا تھا۔شہر کے جنوب میں شارع ہیلا پر جب میں نے کوئی دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر بڑے بڑے ہورڈنگ بورڈز پر باپ بیٹے یعنی حافظ الاسد اور بشارالاسد کو دیکھا تو خود سے کہا۔کہیں دلوں میں بھی ہے یا بس یونہی کھمبوں پر لٹکا ہوا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً کہا۔"ارے کیسی بات کی ہے آپ نے؟ ہمارا محبوب صدر ہے۔

شہر کے سیر سپاٹے کیلئے نکلنے سے قبل میں نے گھر فون کرنے کا سوچا۔سڑک کی مخالف سمت کی ایک دوکان میں داخل ہوئی۔

سامنے بشارالاسد کی قد آدم تصویر کے ساتھ ایران کے ڈاکٹر احمد نژادی کھڑے تھے۔میں تصویر کو دیکھنے میں خاصی محو تھی۔دوکان کا نوجوان لڑکا مسکرایا۔میری طرف دیکھا۔ہاتھوں سے،چہرے سے،آنکھوں کے اشاروں سے گویا مجھے سگنل دیا کہ ان کے صدر کا ایران کے صدر سے بھلا کیا مقابلہ۔

دیکھیں تو ذرا اس کی چمکتی آنکھیں بشارالاسد پر جم گئیں۔

کتنا خوبصورت اونچا لمبا۔احمد نژادی کی ذرا چھوٹی قامت کو اس نے جس انداز میں تمثیلی صورت دی مجھے ہنسی روکنی مشکل ہو گئی تھی۔

دمشق حلب جسے Aleppo بھی کہا جاتا ہے۔ہومز Homs وغیرہ میں بے شمار لوگوں سے میری ملاقاتیں اور بات چیت ہوئی۔سات دن تو میں نے دمشق میں گزارے اور کوئی کونا کھدرا نہ چھوڑا۔عراق کے ساتھ ملنے والے صوبے الزور Alzor میں بغاوت کیسے پھوٹ پڑی میں تو ششدر رہ گئی ہوں۔

شام کی سیاحت کے دوران بے شمار لوگوں سے ملی۔

دمشق یونیورسٹی کی اُستاد ڈاکٹر عروبہ نے بڑی بے رحمی سے پہلی چیڑ پھاڑ تو برطانیہ اور اس کے حالی موالی ملکوں کے حوالے سے کی کہ جنہوں نے اِس پورے خطے کی بندر بانٹ کر دی جو سلطنت عثمانیہ کی عملداری میں تھے۔بڑا تاسف تھا انکے لہجے میں جب وہ بولیں۔اتنی خوبصورت شکل والے مُلک کو ٹیڑھا میڑھا تکونا اور

مثلث نما کر دیا۔شریف مکہ اور انکے بیٹوں کے بھی لتے لیے اور ساتھ برطانیہ کی مشرق وسطیٰ میں منتظم اعلیٰ جرٹروڈ بیل GertrudeBell کو بھی پھٹکارہ۔ یہ ٹوٹا شریف مکہ کو دے دو۔اُردن دوسرے لڑکے کے حوالے کر دو۔یہودیوں کو زمین دو۔ان کے آنسو پونچھو۔سچ تو یہ تھا کہ مسلمانوں کے کرداروں پر بھی ڈاکٹر عُروبہ کا بے لاگ تبصرہ کس کمال کا تھا۔

شام کے موجودہ صدر کے بارے میں بولی تھیں۔سمجھدار ہے۔ایوانوں میں گُھس کر نہیں بیٹھتا۔ہمہ وقت لوگوں سے رابطے میں رہتا ہے۔اچانک کسی قہوہ خانے میں نمودار ہونا اور لوگوں سے گپ شپ لگاتا ہے۔ان کے مسائل سنتا اور انہیں حل کرتا ہے۔ہر شعبے میں اصلاحات کی ہیں۔اتحاد الکتاب العرب (عرب رائٹرز یونین) کے نورالدین الہاشمی نے اپنے صدر کا ذکر محبت سے کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

فرانس میں تعلیم پانے والا سوشلسٹ نظریات کا حامی ڈاکٹر بشار الاسد شامی لوگوں کی رائے کے مطابق ذہین سمجھدار، واضح سوچ اور ذہن، واضح پالیسی رکھنے والا نہایت سرگرم حکمران ہے۔اپنے باپ حافظ الاسد کی بہت سی پالیسیوں سے اُسے اختلاف تھا۔

عرب رائٹرز یونین کو ایک آزاد اور خودمختار ادارہ بنانے میں بشار الاسد کا بہت ہاتھ ہے۔حکومت نے بہت ساری زمینیں اور املاک انہیں دی ہیں۔گھر کی خریداری کیلئے بلاسود قرض، ریٹائرمنٹ کے بعد وظیفہ جو تقریباً 5000 سیریائی پونڈ ماہانہ ہے ملتا ہے ایسی اور بہت سی سہولتیں۔

کانگرس میں 20 فی صد عورتوں کی نمائندگی ہے جن میں ڈاکٹرز، انجینیرز اور وکلاء ہیں۔یونیورسٹیوں اور کالجوں کی بہتات ہے۔ان میں سلیبس ایک ہے۔کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم ہے۔طرز زندگی مغربی ہے۔دیہی علاقوں میں مقامی تہذیب کا رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔عیسائی آبادی کوئی 20 فی صد ہے۔یہودی بھی ہیں مگر بہت کم۔

میرے ایک سوال پر حلب کے ایک بزنس مین صباح مناوی نے کہا۔

دراصل ہمارا دشمن اسرائیل ہے۔ہمارا سارا فوکس اُس پر ہے۔سیاسی پارٹیاں نہ ہونے کی وجہ یہی ہے۔حزب البعث سب سے بڑی پارٹی ہے۔اسرائیل سے جنگ اور مسلسل کشیدگی کی وجہ سے لوگ حکومت کے مخالف نہیں۔

3 جون 1967 کو اسرائیل نے قنیطرہ Quneitra پر قبضہ کر لیا تھا۔شام نے اُسے واپس لے لیا۔اِس واپسی میں کچھ کریڈٹ پاکستان ایرفورس کے پائلٹوں کو بھی جاتا ہے جو ذوالفقار علی بھٹو نے شام کے صدر کی درخواست پر وہاں بھیجے تھے۔دمشق میں ایک بوڑھے جرنلسٹ کے اِس اعتراف پر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔

گولان (جولان) کی پہاڑیاں ابھی بھی اس کے قبضے میں ہیں۔اب الزور Alzor کے سرحدی علاقے میں شامی فوج کا ٹینکوں سے حملہ اور تقریباً 42،40 لوگوں کا مرنا۔سعودی عرب، بحرین اور کویت کی اپنے سفیروں کی واپسی غور طلب باتیں ہیں۔

صوبے الزور کی سرحدیں عراق سے ملتی ہیں۔امریکہ کیلئے اِن علاقوں میں بدامنی، شورش اور ہنگامے پیدا کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ایسے کاموں میں اسکی سی آئی اے ہمیشہ سے طاق ہے۔دراصل اب وہ بشار الاسد کو سزا دینا چاہتا ہے۔سعودی کویت اور بحرین سب اُس کے طفیلیئے۔کویت کا صباخاندان ہو یا سعودیہ کا شاہی خاندان۔اُسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

خدا ہم پر رحم کرے۔

06-09-2011 پاکستان

لمحہ فکریہ

خدا تلواریں ڈھالنے والا لوہار نہیں۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

یہ مناظر ماہِ رمضان کے آخری عشرے میں بہت کثرت سے آپ لوگوں نے دیکھے ہوں گے۔مذہبی پروگراموں کے اختتام پر ٹی وی چینلز پر علماء اور دانشور قسم کے صاحبِ علم و فکر حضرات کی رقت بھری دعائیں،گلوگیر لہجے میں التجائیں، آنکھوں میں چھلکتی نمی، چہرے پر جھلکتی دردمندی اور دعائیہ انداز میں اُٹھے ہاتھوں کی تڑپ، ستائیسویں کی شب، نمازِ تراویح کے بعد، جمعہ کے اجتماعات اور حرم کعبہ میں بھی ایسی ہی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

مُلک کے حالات پر تشویش اور اضطراب کا اظہار۔دنیا بھر کے مسلمانوں پر عتاب، سلامتی، امن اور عافیت کیلئے پکار۔

خدا سے بار بار التجا کہ وہ ان کی دعاؤں میں تاثیر پیدا کردے اور وہ قبولیت کا درجہ پالیں۔سچ تو یہ ہے کہ عام لوگ ہی نہیں بلکہ خاصے پڑھے لکھے بھی چین بجبیں ہیں کہ اتنے واویلوں کے باوجود مسلمانوں پر عتاب اور مردود کافروں پر عنایات، آخر خدا مسلمانوں کی کیوں نہیں سُنتا؟

قوم کے اجتماعی اور انفرادی کردار کی چیر پھاڑ کرنے کی بجائے میں ذرا تھوڑی سی زحمت کی معافی چاہوں گی۔آپ کو تاریخ کے اُس دور میں لے چلتی ہوں جب وہ پُرعزم تُرک نوجوان محمد عثمانی 1453ء کے موسمِ بہار میں قسطنطینہ پر حملے کا فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ یہ اُس کا خواب تھا۔اُسے اپنے مقابلے پر مسیحی یورپی اقوام کا بھی اچھی طرح علم تھا۔

اُس کا پہلا اہم کام جنگی آلات کے اسرار و رموز میں مہارت حاصل کرنے سے متعلق تھا۔لاطینی قوم میں اُس وقت تک جتنے آلات ایجاد کر چکی تھیں اُس نے ایک ایک پر تحقیق کی۔جوئیندہ یابندہ کے مصداق اُسے توپ سازی کا ایک ایسا ماہر ملا جو ہنگری کا رہنے والا تھا۔جس کے فن کی کسی نے قدر نہ کی اور جو بہ امرِ مجبوری سلطان کے پاس آیا۔

سوال جواب کا طویل سلسلہ۔سلطان کی بے پناہ دلچسپی۔دیگر ماہرین کے ساتھ مشاورت۔دن رات کام۔بس توپ خانہ تیار ہوگیا تھا۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیں۔

پوری مسیحی دنیا اُس وقت ایسے ہی جمود کا شکار تھی جو آج کل عالمِ اسلام پر طاری ہے۔بہت سی مغربی اقوام اپنے اندرونی جھگڑوں اور شورشوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔پاپائے روم یونانیوں پر خفا تھا۔موریا اور قریبی جزیروں کے یونانی حکمران بے نیاز اور لاتعلق بنے بیٹھے تھے۔کچھ سلطان محمد کے ایجنٹ بن گئے تھے۔نکولس خامس نے اٹلی کے وسائل قسطنطینہ کیلئے وقف کرنے کی بجائے یہ اعلان کر دیا تھا کہ دشمن تو ہماری پھونکوں سے اُڑ جائے گا۔مسلمانوں کا تو کوئی نام لیوا نہیں رہے گا۔جان لو قسطنطینہ ناقابلِ تسخیر ہے۔احمق ہو۔جنوب مشرق اور شمال کی جانب سمندر ہے۔شاخ زریں کے دہانے پر بھاری زنجیریں بندھی ہیں۔کس جہاز میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اہلِ شہر کی مرضی کے خلاف اس میں داخل ہو۔رہی مغربی سمت۔بھئی وہاں تو دوہری فصیل موجود ہے کون مائی کا لال وہاں سے داخل ہوگا۔

ہاں ایک بات ضرور تھی۔

اپنے اپنے مفادات کے چکروں میں اُلجھی یہ قوم گرجا گھروں میں اکٹھی ہوتیں اور زور و شور سے اُونچے اُونچے دعائیں مانگتی اور دشمن کو نیست و نابود کرنے کی التجائیں کرتی۔

سلطان کا اضطراب اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔نمازِ عشاء کے بعد نقشے کھول کر بیٹھتا۔ماہرین اور سپہ سالاروں سے ایک ایک مرحلے پر بحث ہوتی۔کہاں

سے حملہ ہو۔ کس جانب سے آگے بڑھا جائے ۔ توپیں کہاں کہاں نصب ہوں۔ سپاہ کتنی کتنی تعداد میں اور کب کب حملہ آور ہوں گی۔ سرنگوں کا انتظام۔ سیڑھیاں کن کن جگہوں پر لگائی جائیں۔ پسپائی کے امکانات۔ کم اور تھوڑے نقصان کے ساتھ واپسی، دوبارہ حملے کے امکانات۔ جنگی نقطۂ نظر سے کوئی پہلو تشنہ کام نہ رہتا۔

نمازِ فجر کے بعد ذرا لیٹتا تب بھی اضطراب کا وہ عالم کہ سرہانے پائنتی ہوا جاتا۔

پہلا حملہ خشکی کی جانب سے ہوا جو نا کام ہوا۔

''مجھے شہر فتح کرنا ہے۔ ایک عزمِ صمیم تھا چہرے پر اور دل میں۔ تدابیر، ماہرین سے صلاح مشورے۔ سوچیں۔ پھر باسفورس کے ایک حصّے سے جو بیبک Babec اور ارنوٹ کوئی Aronout Kioy کے آس پاس تھا خلیج قاسم پاشا تک کا راستہ چنا گیا۔ ناہموار اِس راستے پر لکڑی کے تختے بچھائے گئے۔ جانوروں کی چربی سے انہیں چکنا کیا گیا۔ نمازِ عشاء کے بعد خدا کے حضور دعاؤں کے بعد اسّی کشتیاں ہمراہ توپوں اور سپاہیوں کے راتوں رات گولڈن ہارن (Golden Horn) کے پانیوں میں اُتار دی گئیں۔ اب قسطنطنیہ تو فتح ہونا ہی تھا۔

سویڈن سے نیپلز تک ساری یورپی قومیں خداوند خدا کو پکارتی رہ گئی تھیں۔ خدا کے کان بند تھے کیونکہ وہ عمل اور بے عملی کی میزان تھامے بیٹھا تھا۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد عظیم انقلابی شاعر نزار قبانی کی ایک نظم کا یہ شعر آپ کی خدمت میں۔

خدا جسے چاہتا ہے فتح دیتا ہے

خدا تلواریں ڈھالنے والا لوہار نہیں۔

پاکستان 12-09-2011

لمحہ فکریہ

ہمارا حال۔ڈنگ ٹپاؤ۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

ہم کیسی قوم ہیں جو مصائب و آلام کی گھڑیوں میں اکٹھی ہونے کی بجائے اپنے اپنے محاذوں پرمنفی سرگرمیوں میں جُت جاتی ہے۔اپوزیشن کوحکمران جماعت پر کیچڑ اُچھالنے، اُن کی کمزوریوں پرنکتہ چینی کرنے اور لتاڑنے کا نادر موقع مل جاتا ہے۔تاجروں کو کمانے اور لوٹنے کھسوٹنے کے بہانے میسر آجاتے ہیں۔الیکٹرونک میڈیا کے مختلف چینلزکولیڈ (Lead) لینےاوراپنی دوکانداری چمکانے کی پڑجاتی ہے۔

پنجاب میں ڈینگی بخار کی وبا پھوٹی۔سندھ میں سیلاب کی تباہ کاریوں نے ستم ڈھایا اور ڈھا رہا ہے۔کراچی فسادات کی سان پر چڑھا ہوا ہے۔دن دیہاڑے قتل ہو رہے ہیں مگر کسی کو پرواہ ہے کیا؟ایم کیوایم (M.Q.M) کیا، اے این پی (A.N.P) کیا، جماعت اسلامی (J.U.I) کیا، پیپلز پارٹی(P.P.P) کیا کوئی ہے جوانہیں ایک پلیٹ فارم پرا کٹھا کرےاوراس مسئلے کا کچھ حل نکالے۔

سوال تو یہ ہے کہ چاہے سیلاب ہوں، ڈینگی بخارہوں یا زلزلے ہوں۔یہ نہیں کہ آنے والے متوقع خطرات سے حکومتیں آگاہ نہیں ہوتی ہیں۔ہوتی ہیں مگر عوام اُن کی ترجیحات میں نہیں۔حکومت جانتی تھی۔آگاہ تھی کہ اس بار بارشیں معمول سے زیادہ ہونگی تو پھر حفاظتی انتظامات کیوں نہیں ہوئے؟ سندھ کے کتنے شہروں میں تباہی مچی۔کپاس جیسی اہم فصل زیرعتاب آئی۔سبزیوں پیاز کی تو بات ہی چھوڑ دیں۔چلو اس بات کو بھی نظر انداز کردیں کہ لوگوں کے گھروں میں کوڈے کوڈے پانی کھڑا ہےاور وہ بیچارے چارپائیوں پرسامان کی لدلدائی کرکے عافیت کی کوئی جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

صدرصاحب بیرون مُلک دوروں پر۔ان کا چیک اپ۔اطمینان بخش رپورٹ۔ صحت مندی کا سرٹیفکیٹ۔

کیااِس اہم مسئلے سے اچھے انداز میں نہیں نپٹا جا سکتا تھا؟گزشتہ برس بھی اسی انداز میں بارشیں ہوئیں۔تباہیاں مچیں۔مگر ہم ایسی ڈھیٹ قوم ہیں کہ ہم نے بھی صرف ڈنگ ٹپاؤ کام کرنے ہیں۔پنجابی زبان کی کہاوت کے مطابق اُدھروں آئی جنج تے بھڑوگوی دے کن۔بھاگ دوڑ شروع تب ہوگی جب مصیبت گلے کو آکر دبا لے گی۔

جنوری فروری کے مہینوں میں اعلیٰ سطح پر میٹنگ ہوتی۔پانی کی گزرگاہوں کے امکانی جائزے لیے جاتے۔جہاں جہاں پشتوں کے کمزور ہونے کے امکانات تھےان کی مرمت اور مضبوطی کو بہتر بنایا جاتا۔

گھمبیر صورت میں آبادی کے انخلا کی منصوبہ بندی ہوتی۔دوائیں اورخوراک کی فراہمی یقینی بنائی جاتی۔

مگرایسا سب کیوں ہوتا؟شرم آتی ہے۔ڈوب مرنے کوجی چاہتا ہے جب نِک سُک سے آراستہ پیراستہ وزیراعظم دہائی دیتا ہے کہ عالمی برادری ہماری مدد کو آئے۔کوئی پوچھے کہ کب تک مدد مانگتے رہوگے؟ دوسری قومیں بھی اب جان گئی ہیں کہ انہیں تو عادت پڑگئی ہے مانگنے کی۔جن کے لیئے امداد بھیجتے ہیں اُن تک تو پہنچتی نہیں۔سب اوپر والے کھا پی جاتے ہیں۔جس کے سربراہ کے غیر مُلکی دوروں پر وہاں کا میڈیا اپنے وزیراعظم کو ہدایت کرے کہ میاں ہاتھ ملانے کے بعد ذرا اپنی انگلیاں گن لینا۔کم تو نہیں ہوگئیں تو پھر صورت حال کا اندازہ خود ہی لگالیجیے۔

اب پنجاب میں اورخصوصی طورپرصوبائی دارلخلافہ میں پھوٹ پڑنے والی بیماری بھی کوئی نئی نہیں ہے۔خطرہ پیشِ نظر تھا۔گزشتہ سال کی نسبت اِس بار زیادہ وسیع پیمانے پر تباہی کا امکان تھا۔تو پھر حفاظتی انتظامات کیوں نہ ہوئے؟اس وقت شہباز شریف ہلکان ہوئے پڑے ہیں۔دن رات کا چین اپنے اوپر حرام کر رکھا

ہے۔ کیا اِس سے بچا نہیں جا سکتا تھا؟ کیا منصوبہ بندی اور حفاظتی انتظامات وقت سے پہلے نہیں ہو سکتے تھے؟ پھر وہی کہنا پڑے گا کہ ہم ڈنگ ٹپاؤ کام کرتے ہیں۔

ایوب کے زمانے میں باقاعدہ ایک سیل تھا جو مچھروں اور ملیریا کے خلاف کام کرتا تھا۔ اتنی باقاعدگی سے سپرے ہوتا تھا کہ مجھے یاد ہے ہماری اماں بھینس رکھتی تھیں اور چھت پر اُپلے تھاپے جاتے تھے۔ ہم چھت پر ہی سوتے تھے اور مچھر کا کہیں نام و نشان تک نہ ہوتا تھا۔

سری لنکا کے ڈاکٹروں کی ٹیم اب آئی۔ سپرے کی شکایات بھی بڑی عام ہیں۔ اِس کا جائزہ لینا ضروری تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ مخلص اور کام کرنے والے ہیں۔ حالیہ گیلپ (Gallop) پول سروے رپورٹ کے مطابق خیبر پختون خواہ کے وزیر اعلیٰ مائنس 20 پوائنٹ پر کھڑے ہیں۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ مائنس 22 بلوچستان کے منفی 30 جبکہ شہباز شریف پلس 27 پوائنٹس پر ہیں جو بہر حال ایک خوش آئند ہے۔ وہ اپنے طور پر کام میں لگے ہوئے ہیں مگر یہ کام اگر کچھ مہینوں پہلے ہو جاتا تو زیادہ بہتر نتائج حاصل ہوتے اور اموات کی شرح بھی کم ہو جاتی۔

تعلیم کے بعد دوسرا اہم شعبہ صحت کا ہے۔ ہسپتال بھی کتنے ہیں۔ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ آبادی کا حجم جس انداز میں بڑے شہروں پر بڑھ رہا ہے یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

تاہم یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اپنے طور پر وہ پھر بھی باقیوں کی نسبت کام پر جُتا ہوا ہے۔ گورنمنٹ ہسپتالوں میں ویلفیر فارم مہیا ہیں۔ اس فارم پر دواؤں کا حصول فری ہے۔ فری ٹسٹوں اور فری پلیٹ لٹس کی فراہمی یقینی بنائی جارہی ہے۔ بروشرز کے ذریعے آگاہی کی مہم زوروں پر ہے اور فری ہیلپ لائن بھی ایک اچھا قدم ہے مگر کیا کیا جائے کہ یہاں پھر کرپشن اور بے ایمانیاں عروج پر ہیں۔ بیچارے ان پڑھ اور سادہ لوح لوگوں کو کہیں وہ فارم ہی نہیں ملتے اور کہیں خود غرض ڈاکٹر ڈنڈی مارتے ہیں۔ دوائیں لکھتے نہیں۔

پنجاب میں ہیلتھ بجٹ اٹھارہ کروڑ سے آٹھ کروڑ پر آگیا ہے کیونکہ وفاقی حکومت نے منظوری ہی نہیں دی۔ پنجاب کی اپوزیشن کو بھی کچھ خدا کا خوف کرنا چاہیے۔ یہ گھڑی سیاست چمکانے کی نہیں مل کر کام کرنے کی ہے۔ جو کام کر رہا ہے اُس کا ساتھ دینا فرض ہے۔

میڈیا کو بھی اِس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مثبت انداز اپنائے۔ ہم جاہل بے صبری قوم ہیں۔ ذرا سی ڈھیل ملے تو تالو پر چڑھ کر ناچنے لگتے ہیں۔ ہسپتالوں میں تھوڑا سا صبر، ذرا سا حوصلہ اور اپنی باری کا انتظار ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ ہم ہسپتالوں میں داخل ہوں اور ڈاکٹر برآمدوں میں کھڑے ہمارا استقبال کریں۔ الیکٹرونک میڈیا اِس بے صبری کو بہت غلط انداز میں پیش کر رہا ہے۔ سری لنکن ڈاکٹروں کا بیان کہ میڈیا اِسے اتنی ہوا کیوں دے رہا ہے ہماری آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے۔

21-09-2011 پاکستان

لمحہ فکریہ

فریڈم آف عراق یا Destruction Of Iraq

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

کیا مارچ 2003ء کی یہ جنگ فریڈم آف عراق تھی صدام جیسے ڈکٹیٹر سے عراقیوں کو آزاد کروانے کی جس کے لیے امریکی فوجیں ہواؤں کے گھوڑوں پر سوار جھنڈے لہراتے ہوئے بغداد کی سرزمین پر اُتری تھیں ۔یا یہ عراق کی تباہی کا سامان تھیں کہ جنہوں نے بغداد، بصرہ، موصل، کربلا، نجف، اشرف اور کرکوک کو کروز اور ٹام ہاک میزائلوں کی بارش میں نہلا کر لہولہان کر دیا تھا۔اور ابھی تک عراق لہولہان ہے ۔2010ء کے وسط میں مَیں نے بغداد کی سرزمین پر قدم رکھا اور جگہ جگہ چیک پوسٹیں دیکھ کر یہ جان پائی کہ بغداد تو ہنوز حالتِ جنگ میں ہے۔

حملہ آور تو گرین زون کے پُر آسائش محلوں میں بیٹھے تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر گامزن ہیں اور بھولے بھالے معصوم لوگ شکار ہو رہے ہیں۔

تو اب مزید کچھ تبصرہ کرنے کی بجائے میں آپ کو عراقیوں سے ملاتی ہوں۔ذرا سُنیے اور حالات کے قلب میں جھانک کر دیکھیے کہ آخر امریکہ دُنیا اور انسانیت کی تباہی کے کیسے درپے ہے۔

کاظمین کے علاقے میں چیک پوسٹ کے پاس اِس بہت بڑے جنرل سٹور کے مالک سے میں نے صدام کے زمانے اور موجودہ صورت کا موازنہ جاننا چاہا۔

متین سے مرد کا جواب تھا۔صدام کے زمانے میں ہماری زبان بند تھی مگر امن تھا۔اب ہماری زبان تو کھل گئی ہے ہم بول سکتے ہیں مگر امن و امان کی حالت انتہائی مخدوش ہے۔آپ گھر سے نکلتے ہیں تو جانتے نہیں کہ واپسی ہوگی یا نہیں۔

پاس کھڑا دوسرا عراقی امریکہ کے بارے میں بولا تھا تو لگا جیسے لہجے میں زہر گھل گیا ہو۔

امریکہ سے بڑا لعنتی شاید ہی دُنیا میں کوئی ہو۔ساتھ ہی زمین پر تھوک دیا۔صدام بھی لعنتی۔ایک بار پھر تھوکا۔

فندق ذوالفقار ہوٹل کے ریسپشن پر جولڑکا بیٹھا تھا مروان تھا۔انگریزی صاف سُتھری بولتا تھا۔تعارف کروایا تو پاس بٹھا لیا۔کمپیوٹر پر بغداد کے شب و روز دوڑنے لگے تھے۔کتنی تصویریں اُن بدقسمت عراقیوں کی دکھا دیں جو سڑکوں پر مرے پڑے تھے۔کسی کی ٹانگیں غائب، کسی کا سر غائب، کہیں بازو، کہیں دھڑ ندارد۔جلتی عمارتیں، شعلے اُگلتی گاڑیاں اور ان قیامت جیسے لمحوں میں سامان لوٹتے لوگ۔

سکرین پر نئے منظر اُبھرے تھے۔

قُران لائبریری بغداد لائبریری آگ میں جل رہی تھیں۔عہد عثمانیہ کے حد قیمتی نُسخے، قرآن پاک کے قدیم ترین مخطوطے فٹ پاتھوں پر سڑکوں پر ادھ جلے ٹکڑوں اور پورے جلے راکھ کے ڈھیروں کی صورت پڑے تھے۔

ہلاکو خان جاہل تھا۔اُسے کتاب کی عظمت سے آگاہی نہ تھی۔عہد عباسیہ خصوصاً عہد ہارونی میں یونانی، رومی، سنسکرت، ژند، فارسی، سریانی، قبطی زبانوں میں لکھی گئی نادر کتابیں جنہیں دنیا بھر سے بغداد لا کر تراجم کی صورت جس انداز میں محفوظ کیا گیا۔اُس نے علم و آگہی کے دیئے یوں روشن کیے کہ بغداد جگمگا اُٹھا۔انسانی فکر کو جلا ملی اور شہر علم و ادب کا گہوارہ بن کر پوری دنیا میں ممتاز ہوا۔اُس وقت کی دُنیا کے دو ہی تو نام تھے۔بغداد اور قرطبہ۔

ہلاکو یہ سب نہیں جانتا تھا۔اسی لیے اُس نے دجلہ کا پانی سیاہ کر دیا تھا۔غرناطہ کے عیسائی تو کتاب کی اہمیت سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ کتاب دنیا کا

مشترکہ اثاثہ ہے انہوں نے کیوں راکھ کے ڈھیر لگائے؟ عصر حاضر کے ہلاکو خان سے زیادہ بھلا کتاب سے کون واقف ہوسکتا ہے؟

پھر۔

ایک بڑا سوال میرے سامنے تھا۔

شاید وہ نئی صدی کے انسان کو انسانیت کے اِس تحفے سے نوازنا چاہتا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر سکرین پر نظریں جمادی تھیں۔

مروان صدام کی بعض پالیسیوں کا ناقد تھا۔ بعض کا حامی۔ تعلیم پر حکومت کی خصوصی توجہ۔ مفت اور لازمی۔ ہر عراقی اسی لیے پڑھا لکھا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں صاف پانی کے پلانٹ۔ ظالم بھی بڑا تھا۔ اپنے دامادوں اور بیٹے تک کو نہ چھوڑا۔ بیچاری عام پبلک کس کھاتے میں۔

کلک کلک ہوئی تھی۔ اُودے حسین سکرین پر نمودار ہوا۔ صدام کا بڑا بیٹا۔ بڑا رعنا جوان تھا۔ قصئے حسین کو بھی دیکھا۔ وہ بھی شہزادہ تھا۔ دونوں بیٹے امریکیوں کے خلاف مزاحمت میں مارے گئے۔ اُودے حسین کی کہانی نے لرزادیا۔

میرے تو سارے وجود نے جھرجھری لی تھی۔ صدام کے گھر ے دوست اور اُودے کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ دوست مارا گیا۔ صدام کو معلوم ہوا۔ پہلے تو بیٹے کو مار مار کر اُس کا بھُرتہ بنایا۔ ہسپتال پہنچایا۔ پھر عدالت میں گھسیٹا۔ ماں نے بیٹے کو بچانے کیلئے کوشش کی تو اُسے خاتون اوّل کے سارے اعزازات سے محروم کر دیا۔ ساجدہ اُسکی چچا زاد، بچپن کی ساتھی، رازدار، بچوں کی ماں۔ زندگی کے ہر اُتار چڑھاؤ میں اُس کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی۔ اُسے سزا دی۔ دوست کی بیوی سے شادی کی اور سمیرا خاتون اوّل بن گئی۔

دونوں بیٹیوں راغدہ اور رعنا کی شادیاں اپنے سگے بھانجوں سے کیں۔ سُسر اور دامادوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔ دونوں داماد اپنی بیویوں کے ساتھ امریکہ چلے گئے جہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ انہیں واپس لانے میں شاہ اردن نے بڑا کردار ادا کیا۔

بیچارے بغداد آئے تو پہلا کام دونوں کو قتل کرنے کا ہوا۔

سکرین پر بڑی خوبصورت لڑکیاں پھول جیسے بچوں کے ساتھ دیکھیں تو بے اختیار افسوس کے پاتال میں گرتی چلی گئی۔ کیا انسان تھا۔ کیسی شخصیت تھی۔ سفاک بے رحم۔ نرالا اور انوکھا۔

خلیجی جنگ پر اپنی قوم سے خطاب پر سلامتی کونسل کے جس انداز میں لتے لیے گئے میں تو اُس کا ترجمہ سُن کر دنگ تھی۔ جارج بُش کے والد سینئر بُش کو جو خط لکھا گیا وہ بھی بڑا اہم تھا۔

وہ احمق تھا۔ بہادر تھا۔ ابھی تو لوگوں سے ملنا تھا۔

سفارتی دُنیا کے ایک معتبر امریکی سفارت کار ریان سی کروکر

Rayan C Croker کے الفاظ یاد آئے تھے۔ عراقی اور افغانی دنیا کی مشکل اور عجیب قومیں۔

اور وہ دونوں سے پنگا لیے بیٹھے تھے۔

04-10-2011 پاکستان

لمحہ فکریہ

فریڈم آف عراق یا Destruction Of Iraq

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

بم دھماکوں کی وجہ پوچھنے پر مروان بولا تھا۔

"مخبر سے استعماری طاقتیں مفاد پرست سُنّی اور شیعہ ٹولوں کو لڑا لڑا کر مروا رہی ہیں۔دونوں بڑے فرقے ایک دوسرے کا بیج مارنے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔"

شام دجلہ کے پانیوں پر اُتری ہوئی تھی اور منظر میں خوف کے باوجود میرے لیے کس قدر رعنائی تھی۔جب میں فقیہہ اعظم حضرت امام ابوحنیفہ کے مزار پر پہنچی۔یہاں سکون اور خاموشی تھی۔زائرین نہ ہونے کے برابر تھے۔

اُس وقت روضہ مبارک کے منتظم اعلیٰ جو بڑی مہربان اور مرنجان مرنج سی شخصیت نظر آتے تھے خود موجود تھے۔سفید براق داڑھی پُرنور چہرے سے ٹپکتی محبت اور متانت متاثر کرتی تھی۔خوبصورت انگریزی بولتے تھے۔مزار مبارک کے پاس ہی کُرسی پر بیٹھے تھے۔

آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔انہوں نے چہرہ اُٹھا کر مجھے بغور دیکھا۔چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اثبات میں سر ہلایا۔انکے قریب ہی بیٹھنے کی اجازت ملنے پر میں سامنے قالین پر بیٹھ گئی تھی۔

کچھ روشنی ڈالیے۔کچھ بتائیے آپ کی نظر ان حالات کو کس تناظر میں دیکھتی ہے؟

کاش میں اُن سے کچھ نہ پُوچھتی۔وہ پھٹ پڑے تھے۔

امریکیوں سے کہیں زیادہ وہ سعودی عرب،اُردن اور دیگر اسلامی ملکوں کی مفاد پرستیوں پر برہم تھے۔سعودی شاہوں کے وہ لتے لیتے تھے انہوں نے کہ میں اُن کے لفظوں کو زبان ہی نہیں دے سکتی۔

کاش ڈوب مرنے کیلئے کوئی جگہ ہوتی۔جنرل ضیا الحق نے فلسطینیوں پر جو ٹینک توپیں چلائی تھیں وہ اُس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے آگاہ تھے۔پاکستان کے حکمرانوں کو شرم آنی چاہیے تھی۔جی چاہا تھا سر پیٹ لوں۔ابھی تو یہ مقام شُکر تھا کہ ڈالروں کے لالچ میں عراق میں فوجیں نہیں بھیجیں۔

افسوس صد افسوس۔یہی سب کچھ ہوا ہے مسلمانوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے۔یہ اُلّو کا پٹھا صدام بوسنیا اور کوسوو میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر سربیا کے ملاسووچ کی حمایت کرتا تھا۔کبھی جو اُس کے پھوٹے مُنہ سے مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے بھارتی مظالم پر بھارت کی لعن طعن کے لیے چند لفظ نکلے ہوں۔افغانستان پر سوویت یونین کے قبضے پر حمایت ہوتی ہے۔ایران عراق اور خلیجی جنگ میں مرنے والے کون تھے مسلمان۔یہی ہونا تھا اس کے ساتھ جو ہوا۔عراق میں تباہی کے مناظر دیکھیں۔غریبوں کی لاشوں کی بے حرمتی۔خدا راضی ہو ہمارے نوجوان رضاکاروں سے جنہوں نے ان کی لاشیں گلتے بلیوں سے محفوظ رکھیں۔

اسرائیل کے بارے میں بہر حال اُس کا واضح موقف تھا۔وہ نہ صرف اسرائیل کے خلاف تھا بلکہ اُن فدائیوں کی مالی معاونت بھی کرتا تھا جو اسرائیل پر حملوں کے دوران شہید ہو جاتے تھے۔

اُس کی ذات کا یہ رُخ انہیں دکھانا یا اس پر بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔

کیا وہ آگاہ نہ ہونگے؟ابھی ایک دن پہلے غوث اعظم حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار مبارک پر حاضری کے دوران میری ملاقات وہاں کے متولی کی

صاحبزادیوں ثنا اور فائزہ سے ہوئی تھی جن کے والد کوئی تیس سال قبل پاکستان سے بغداد آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔

وہ دونوں جنگ اور صدام کے بارے میں بڑی جذباتی تھیں۔ اُسے امریکی ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ میں نہیں مانتی۔ وہ محبِّ وطن سرپھرا تھا۔ ضدی، ہٹ دھرم اور آمر۔ تعلیم صحت اور روزگار کی فراہمی میں مخلص۔ غریب کی زندگی آسان تھی۔ خلیج کی جنگ میں بجلی، پانی اور فون کا ایک مہینے کا بل صرف ایک ڈالر ہوتا تھا۔ ہمارا دینار مضبوط تھا۔ شیعہ سُنی کو نتھ ڈالی ہوئی تھی۔

یہ یقیناً میری خوش قسمتی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور افلاق جیسا لڑکا بیبا اور بالغ نظر ملا تھا۔ بغداد کے اعظمیہ محلّے میں رہنے والا جس کا خاندان اس جنگ میں گھر کے زمین بوس ہو جانے پر شہید ہو گیا تھا۔ جس کی نس نس میں امریکیوں کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا۔ بغداد یونیورسٹی کا پوسٹ گریجویٹ جو نامساعد حالات کی وجہ سے اب ٹیکسی چلانے پر مجبور تھا اور جو مجھے ہر جگہ لے گیا جہاں متعین لوگوں نے اِس اعتماد پر کہ افلاق ساتھ ہے کھُل کر باتیں کیں۔

یادگار شہدا پر وہ مجھے اُس جگہ لے گیا جہاں غیر ملکی وفود پھولوں کی چادر چڑھانے آتے تھے۔ کیوبا کا فیڈل کاسترو بھی یہاں آیا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

فیڈل کاسترو بھی ایک شے۔

پہلے صدام کی لن ترانیاں سُنی ہوں گی۔ بلند بانگ دعوے اور گپیں کہ وہ تو امریکہ کو جُوتی کی نوک پر رکھتا ہے۔ جو کاغذ اُسے بھیجتے ہیں وہ تو پڑھے بغیر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ پرکاہ برابر اہمیت نہیں دیتا۔ ٹشو پیپر سے زیادہ کی حیثیت نہیں ہے میری نظر میں اُن کی۔ بڑی بڑھکیں ماری ہوں گی کہ وہ ایسے ہی مارتا تھا۔

ہائے میں نے لمبی سانس کھینچی۔ تدبر اور سیاسی فراست سے خالی کھوپڑی۔

ٹشو پیپر ہی کی طرح مسل دی گئی تھی۔

جی چاہا تھا آہوں کا ڈھیر لگا دوں۔

گاڑی میں بیٹھی تو یہ جانی تھی کہ اب افلاق مجھے ''نئی یادگار شہداء'' لے جا رہا ہے۔ یعنی عراق ایران ڈرامے کا ایک اور ایپی سوڈ۔

وہیں میری ملاقات اُس ماڈرن سی خاتون جو بغداد ڈگری کالج میں اکنامکس پڑھاتی تھی سے ہوئی۔ شوہر بزنس مین تھا۔ تین پیارے بچے تھے۔

خاتون صاحبِ نظر تھی۔ باتیں شروع ہوئیں تو جیسے پردے چاک ہونے لگے۔ ایران عراق جنگ پر اُس نے لمبی سانس بھری تھی۔ جب لیڈروں کا مطمعِ نظر قوم کی بجائے اپنی ذات کے اُبھار اور نمائش کے گرد گھومتا ہو۔ جب اُنہیں بین الاقوامی لیڈر بننے کا خبط ہو جب وژن محدود سا ہو پھر یہی کچھ ہوتا ہے جو ہوا مگر فریقین کو لعن طعن کی بجائے اس کے پاس نئی نسل کا دُکھ تھا۔

آپ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں کہ دونوں اطراف کی نوخیز اور نوجوان نسل کیسے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح فنا کی دھول میں گُم ہوئی۔

پاکستان 05-10-2011

لمحہ فکریہ

فریڈم آف عراق یا Destruction Of Iraq

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

اُس کا شوہر ابو بکر محمد الزکریا مجھے کم گو معلوم ہوتا تھا کہ اب تک کی گفتگو میں پہلی بار شامل ہوا تھا۔اندازاً کوئی پونے تین لاکھ ایرانی ڈیڑھ لاکھ عراقی اس بے کار جنگ میں ختم ہوئے۔کوئی اسی ۸۰ ہزار تعداد زخمیوں اور دس لاکھ کے قریب متاثرین تھے۔باقی نقصان بھی بے شمار تھا۔

دُنیا نے تماشا دیکھا۔اور اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کیا اور خوش ہوئے کہ دو مسلمان مُلک جو بڑھتی ہوئی طاقت تھے کمزور ہوئے۔کاش صدام سمجھدار ہوتا۔کاش امام خمینی بصیرت سے کام لیتے اور دونوں مُلک تباہ ہونے سے بچ جاتے۔

پھر انہوں نے اجازت چاہی۔دونوں میاں بیوی نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔وہ ال اُمل (ul'ummal) شارع خالد بن ولید پر رہتے تھے۔موبائل کا سیل نمبر انہوں نے میری کاپی پر لکھا اور گھر آنے کی پُرزور تاکید کی۔

چلو میں بھی چاہتی تھی کو افلاق کے ہوتے ہوئے یہ چہتا تو نہ تھی مگر یہ خاتون
حالاتِ حاضرہ سے واقف اور بالغ نظر لگی تھی۔

پھر میں یادگار کے آڈیٹوریم میں چلی گئی۔یہاں مجھے عبدالکریم ملا جو ادارے کا منتظم اعلیٰ تھا۔سلیمانیہ کا کرد بڑے عمیق اور پھیلے ہوئے وژن کا مالک۔میں نے امریکہ کے کردار کے بارے میں جاننا چاہا تھا اور وہ بولا تھا دراصل بنیادی خرابی یہیں تھی۔

امریکہ سے انقلاب ایران ہضم نہیں ہو رہا تھا۔وہ اپنے اُس پٹھو شاہ ایران کی دوبارہ بحالی کیلئے سرگرم تھا۔صدام حسین بھی اس جیسی خواہشات رکھنے والا اُسکا بھیٗی بھائی بند تھا۔اسی لیئے امریکہ کو صدام کے علاوہ کوئی اور موزوں بندہ نہیں نظر آتا تھا۔

امام خمینی بھی اُس سیاسی بصیرت سے محروم تھا جو اُس جیسے انقلابی کیلئے ضروری تھی۔انہیں عراق کی شیعہ آبادی پر کیے جانے والے جبر اور پابندیوں پر غُصہ تھا۔عراقی حکومت ان کے نزدیک شیطانی تھی اور وہ اپنی پوری توانائیوں سے نعرہ بازی میں مصروف تھے۔اور اس اہم نُقطے کو انہوں نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا کہ عراق کی شیعہ آبادی مسلک سے کہیں زیادہ اپنے عراقی تعلق کی وفادار ہے۔اُن کیلئے اپنا مُلک, قبیلہ اور تاریخ کہیں زیادہ اہم ہے۔

فوج میں 1920 سے 1958 تک شیعہ عنصر نہ ہونے کے برابر تھا۔مگر آزادی کے فوراً بعد اسمیں بہت اضافہ ہوا۔اب ذرا بڑی طاقتوں کے مفادات کو تو دیکھیں۔

امریکہ اور برطانیہ کی سپورٹ عراق کے لئے۔اسرائیل عراق کی بڑھتی طاقت سے خائف،ایران کا مددگار اور حامی بنا ہوا تھا۔خیر سے بری اور فضائی جنگ میں ٹینکوں اور طیاروں کے پُرزوں کی تیز ترین فراہمی اسرائیل کے توسط سے انجام پا رہی تھی۔جنگ طول پکڑ رہی تھی اور لاشوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

صدام کو اپنی حماقتوں کا تو شاید احساس نہ ہوا ہو پر اپنا مستقبل ضرور داؤ پر لگتا نظر آیا تھا۔جھکنے میں عافیت جانی اور یک طرفہ جنگ بندی کی ذاتی پیش کش کر دی۔

قوموں کی تاریخ میں المیے شاید جنم نہ لیں اگر کہیں فہم و فراست اور تدبر کے دیئے کوئی ایک طرف ہی جلا دے۔

اب امام خمینی نہیں مانے ۔۱۹۷۵ والی بین الاقوامی سرحد کو مستقل تسلیم کرنے اور امام خمینی سے انکی پسند کے کسی مقام پر ملنے کا صدام کی طرف سے اظہار ہوا۔ مگر وہاں ٹھوس انکار تھا۔

آٹھ سال خون مسلم کی ارزانی ۔اسلحہ کے بیوپاریوں کی موجیں ۔جنگ کا اختتام جب ہوا۔نتیجہ یہ تھا کہ اِس لا حاصل جنگ کا کوئی فاتح نہیں تھا۔دونوں کے حصّوں میں تباہی بربادی اور کمزوری آئی تھی ۔

یہ یادگار شہدا جسے دیکھ کر دل دُکھا تھا۔اس کے بنانے کی کوئی ضرورت تھی ۔ایسی ہی حماقت کا اظہار ایران نے بھی کیا ہوگا۔

میں نے افلاق سے پوچھا تھا۔

تہران میں میں نے ''خون کا فوارہ'' دیکھا ہے ۔وہ اس دعوے کے ساتھ ہے کہ انہوں نے عراق کا کچومر نکال دیا ہے ۔

Chadiria برج سے ذرا آگے عظیم الشان بغداد یونیورسٹی ہے ۔جدید طرزِ تعمیر کی حامل ۔افلاق مجھے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔ڈیپارٹمنٹ میں اُن دِنوں سیمینار ہو رہا تھا۔چھٹیاں ہونے کے باوجود طلبہ و طالبات کی خاصی بڑی تعداد حاضر تھی ۔ڈرائیو وے پر بسیں کھڑی تھیں ۔ایک میں سٹوڈنٹس بیٹھ رہے تھے ۔عباؤں کے ساتھ ساتھ لونگ سکرٹ پہننے والی لڑکیاں بھی تھیں ۔شارٹ سکرٹ میں صرف ایک لڑکی میں نے اوپر چڑھتے دیکھی تھی ۔بیشتر لڑکیاں سکارفوں سے سر ڈھانپے ہوئے تھیں ۔جنگ سے پہلے یہ ماحول نہیں تھا۔آزادی اور کھُل ڈُل خاصی تھی ۔

اب کیا لوگ مذہبی ہوگئے ہیں؟

نہیں ۔القاعدہ اور انتہا پسندوں کی طرف سے ملنے والی دھمکیوں کا اثر ہے ۔

میں ہنس پڑی تھی ۔

یہاں میری ملاقات فیکلٹی کے چند ممبران سے ہوئی ۔تعلیم عراق کی اولین ترجیح تھی ۔مُلک بھر میں پھیلے ٹیکنیکل ٹریننگ سکول اور کالج بغداد یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔

بصرہ موصل اور المستنصر یہ یونیوسٹی عراق کی بہترین یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہیں ۔

وہ مجھے تعلیمی مراحل سے آگاہ کر رہے تھے جبکہ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ اُن لوگوں کا ردِّعمل موجودہ حالات میں کیا ہیں ۔

یہ حساس اور ذہین لوگ تھے جنہیں اپنے وسائل کے لٹنے کا احساس تھا۔وہ ہمارے سونے کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے ہیں ۔ہمارے خوبصورت ہوٹلوں ہمارے شاندار دفتر سب آگ کی بھٹی چڑھا دیئے گئے ۔المنصور جیسے بہت سے فائیو سٹار ہوٹلوں کو آگ لگا دی گئی تھی ۔گلی کوچوں میں موت ناچتی تھی یا چور ڈاکو ناچتے پھرتے تھے ۔ہمارے بینک لٹ رہے تھے ۔اُن کے لیئے اِس آزادی کا مطلب ہی اور تھا۔ہسپتال تک اُن سے محفوظ نہ تھے اور وہ جو صدام کی قید میں جکڑے ہوئے عراقیوں کو آزاد کروانے آئے تھے ۔بغداد کے در و دیوار پر چھوٹی پھُلجھڑیوں سے کھڑے محفوظ ہو رہے تھے ۔

پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں سے بات چیت کا یہ دلچسپ تجربہ تھا۔فیکلٹی کے کشادہ کمرے میں صوفے کم اور کرسیاں زیادہ تھیں ۔یہاں گیارہ لوگ تھے ۔کچھ اُدھیڑ عمر اور جوان ۔مگر جب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا مجھے احساس ہوا تھا کہ اُن میں سے ایک دو کے علاوہ کوئی بھی نہ صدام کا حامی تھا اور نہ امریکہ کا۔

ذرا کونے میں بیٹھے قدرے گندمی رنگ کے نوجوان کو جس کا نام ابوالمنیب الرازی تھا کو جنگ سے بھی زیادہ اقتصادی پابندیوں پر غصّہ تھا۔گلف وار سے قبل مُلک کا فی کس جی این پی (Gross National Product) 3000 ہزار ڈالر تھا جو 2001 میں گھٹتے گھٹتے صرف 500 ڈالر پر آگیا تھا۔بے غیرت لوگ سیال سونے کے دولت سے مالا مال مُلک جسے دُنیا کا غریب ترین مُلک بنا دیا گیا ۔اُس کی آواز میں مجھے اب زیادہ بھراہٹ محسوس ہوئی تھی ۔

سوال ذہن میں کنکری کی طرح چُبھ رہا تھا کہ چلو صدام تو اقتدار میں تھا۔غریب لوگوں کی کیا خطا؟ وہ بیچارے نہ تین نہ تیرہ میں ۔انہیں کس بات کی سزا دی گئی ؟ کہاں ہیں ان کے انسانی حقوق؟

کوئی چالیس کے پیٹے میں بڑی سنجیدہ اور مدبّری شخصیت نام جن کا مقتدیٰ الصدر آبائی شہر موصل تھا نے متانت سے کہا۔امریکہ کے پاس کوئی آپشن نہیں تھی ۔صدام کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔امریکہ کی یہ کمزوری حکمرانوں کو بھی سمجھ آگئی تھی ۔بنیادی سہولتوں کی فراہمی کیلئے غریب عوام حکومت کی اور محتاج ہو کر رہ گئی تھی ۔

اور یوں اُس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔جنوبی عراق میں حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں کا جس بے دردی سے گلا گھونٹا گیا اُس کے بارے میں تفصیلات رونگٹے کھڑے کرنے والی ہیں۔

میں نے لمبی سانس کھینچ کر اپنے آپ سے کہا تھا۔"ارے بیبا میرے کیا رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔میرے مُلک میں کُرسی بچانے کیلئے جو طوفان اُٹھائے جاتے ہیں اُن کی تفصیل سناؤں تو تمہارے بھی ہوش اُڑ جائیں شاید۔

آپ لوگ سمجھتے ہیں صدام امریکی ایجنٹ تھا۔

دو نے کہا امریکہ سُپر پاور ہے۔دُنیا کے حکمران اس کے ایجنٹ ہیں۔بقیہ کا کہنا تھا سو فی صد تھا۔کویت پر حملہ امریکہ کی مرضی کے مطابق ہوا۔

اور ایران عراق کے بارے میں کیا خیال ہے؟

یہاں اختلاف رائے تھا۔میں شیعہ اور سُنّی کی تفصیل میں جائے بغیر جان گئی تھی اِس محفل میں کون شیعہ ہے اور کون سُنّی۔

یہاں موجود شیعہ حضرات ایران کے بارے میں جذباتی تھے اور اُسے اس طرح تنقیدی کسوٹی پر نہیں پرکھ رہے تھے جس کی بے لاگ تجزیہ کرتے وقت ضرورت ہوتی ہے۔

ایران پر حملہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ایران کی انقلابی حکومت کچھ زیادہ تر تنگ میں تھی۔سرحدوں کی مسلسل خلاف ورزیاں اُن کا معمول تھا۔صدام کی حکومت کو ختم کرنے کی بھی کوشش ہوئی۔

اس پر شور ہوا۔حقائق کو مروڑو مت زلمے۔صدام کو عرب دُنیا کا لیڈر بننے کا جنون تھا۔پھر مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ پاکستان ہندوستان پر بحث ہوئی۔یہاں مغرب کے لوگوں کی انسان دوستی، اُن کا احتجاج اور ان کے رویّے سامنے آئے۔مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید انڈونیشیا اور ملائشیا حتیٰ کہ اسٹریلیا کے لوگوں پر بحث ہوئی۔

احتجاج کے لیے یہ لوگ سڑکوں پر کیوں نکلے تھے کہ تیل کی دولت سے مالا مال عرب دُنیا پر سامراجیوں کو مزید دولت سمیٹنے کو موقع نہ ملے۔

سعودی عرب، اُردن اور مصر کے سربراہوں کے بدترین کرداروں اور رویّوں پر بحث ہوئی۔

دُنیا کی سُپر پاور۔بے غیرت اور جھوٹ کی پنڈ۔حملے کیلئے بہانے کیسے جھوٹے گھڑے۔

موجودہ حکومت کے بارے میں پوچھا۔

''دلاّل ہیں اُنکے۔کسی نے بیچ میں سے لُقمہ دیا۔جو چلا گیا وہ بڑا تھا۔یہ ذرا چھوٹے ہیں۔عراق کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ سوال میں نے کیا تھا اور ڈرتے ڈرتے کیا تھا کہ اگر انہوں نے جواباً مجھ سے پوچھ لیا کہ پاکستان کے بارے میں کیا کہتی ہیں تو کیا کہوں گی۔میرے سامنے تو اندھیرے تھے۔اُمید کو کوئی کرن نہیں تھی۔اور یہاں بھی مجھے تاریکی ہی نظر آتی تھی۔

جنگ کے بعد ہمیں ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید امریکہ عراق کو جاپان جیسی حیثیت دے دے۔یقیناً ایسی صورت میں اُس کے سارے خون معاف ہوسکتے تھے۔فوج کے چند سینئر افسران کو اگر خرید ا گیا تو وہیں ایک عنصر نے اسی سوچ کے تحت کچھ زیادہ مزاحمت بھی نہیں کی تھی وگرنہ قبضہ اتنا آسان بھی نہ ہوتا۔مگر اس وقت تک حالات مایوس کُن ہیں۔شیعہ سُنّی عنصر ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے میں مصروف ہیں اور سامراج کے سارے راستے آسان ہوتے گئے۔

قہوہ بڑا کسیلا سا تھا۔ایک گفتگو کا کسیلا پن اور تلخی۔اُوپر سے گرمی موسم اور ستم بالائے ستم قہوے کی کڑواہٹ جو دو چینی کے چمچوں کے بعد بھی قائم تھی۔

ہاں اسپتالوں میں جانا مت بھولیں۔معصوم بچوں اور عورتوں کو ضرور دیکھیں۔انسانیت کے علمبرداروں نے کیسے انسانیت کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔عماریہ شیلٹر سینٹر بھی جانا مت بھولیں۔

06-10-2011 پاکستان

جب چینی سوپر پاور ہوں گے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

بڑی خوش آئند بات اِس بار کچھ نئے اندازِ فکر کے حامل مضامین سامنے آئے۔ایک نیا رُخ۔حقیقت پسند تجزیے۔

محمد نعیم اختر کا مضمون "سنکیانگ میں شورش"۔مجھے اُٹھا کر بالائی ہنزہ کے پھسو کے اُس گھر میں لے گئی جہاں میں سنکیانگ کے مشہور شہر اُرمچی سے 1995ء میں وہاں ہونے والے فسادات سے بددل ہو کر نقل مکانی کر کے یہاں آبسنے والے اسماعیلی خاندان کے ہاں مہمان ہوئی تھی۔ان لوگوں کے ہجرت کر کے آنے کی وجوہات کے کھانے پر زیرِ بحث آئی تھی کہ کاشغر کے مشہور شہر شوفو سے آئے ہوئے اُن کے عزیز عُمرے پر جانے کیلئے ان کے پاس آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔مزے کی بات یہ رشتہ دار حنفی مسلک سے تھے۔

چین عظیم دوست،چینی قابلِ اعتماد ساتھی۔جب سے ہوش سنبھالا تھا یہی سُنتے آئے تھے۔یوں ایک بار کہیں دانشوروں کی محفل میں کسی تجزیہ نگار نے کہا۔ہر مُلک اپنے مفادات کا تابع ہوتا ہے۔دوستی انہی دائروں کے گرد گھومتی ہے۔پاکستانی جذباتی قوم ہے توقعات کے پہاڑ کھڑے کر لیتی ہے۔

اِس دوستی میں شکوک وشبہات،تھوڑی تلخی،گِلے شکوے کا عنصر اس وقت اُبھرا جب سنکیانگ میں چینی مسلمانوں کا اضطراب 2009ء میں سامنے آیا۔اُن پر ٹینک تو پیں چلیں۔چینی حکومت کا کہنا تھا کہ اِن شرپسندوں کی پُشت پناہی پاکستان کر رہا ہے۔گو پاکستانی میڈیا نے اِن خبروں کو اُچھالا نہیں مگر کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت بدگمانی کا عنصر ضرور تھا۔

صاحب خانہ بہت بالغ نظر اور واقعات کو تعصب کی عینک اتار کر دیکھنے کے قائل تھے۔ان باتوں کو سنتے ہوئے میں نے انہیں دیکھا اور پوچھا۔وہ رسان سے بولے تھے۔پاکستان اِن معاملات میں توازن اور اعتدال کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔اُس کی مسلمانیت ہمیشہ اُس کے لیے آگ میں بلا سوچے سمجھے کود پڑنے کا کہتی ہے۔یقیناً لاشیری ہوئی ہوگی۔ایسا ممکن نہیں کہ چین بلاوجہ ایسے اعتراضات کرے۔

اُس شب میرے لیے بہت سارے سنسنی خیز انکشافات تھے۔چین کے انتہائی مغرب میں اویغور (ٹرک) خودمختار علاقہ سنکیانگ کہلاتا ہے۔چھ لاکھ پینتیس ہزار آٹھ سو مربع میل پر مشتمل یہ علاقہ ٹرکوں ہن یا ہان قازق،تاجک، ازبک اور تاتاری مسلمانوں کا وطن ہے جو اُرمچی Urumchi،کاشغر Kashghar،یارقند Yarkand،آکسو Akso اور کلدجہ Kuldaja میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مشہور ریت کا صحرا تکلامکان اسی سنکیانگ میں واقع ہے۔پہلے اِسے چینی ترکستان بھی کہا جاتا تھا مگر اب یہ سنکیانگ یعنی Border Land کہلاتا ہے۔گو یہ لوگ امن پسند اور صلح جو قسم کے ہیں مگر اِن میں کچھ قوموں کے شرپسند بھی گھس آئے ہیں جو ان کی مسلمانیت کو بلیک میل کرنے اور انہیں شورش بپا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

کِس قدر حسرت تھی شوفو خاندان کے اُس سربراہ کے لہجے میں جسے ڈاکٹر عزیز شاہ نے زبان دی تھی جو میرے ساتھ ہنزہ سے چلے تھے اور اس گھر کے رشتہ دار تھے۔

عمرہ حج پر جانے اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پر کتنی پابندیاں ہیں بتانا مشکل ہے۔کوئی پانچ بار کی درخواست کے بعد اب کہیں اجازت ملی ہے۔گزشتہ ماہ تاشقرغن سے بیس نوجوان لڑکوں کو پکڑ کر لے گئے۔اُن پر الزام تھا کہ پاکستانی طالبان سے اُن کے مراسم ہیں۔کہیں انہیں القاعدہ کے ساتھ جوڑنے کی کوشش ہوتی ہے۔اقلیتوں کو اگر مراعات دی جائیں،ان کے اعتقادات کا خیال رکھا جائے تو انہیں کیا غرض ہے کہ وہ حکومت کے خلاف ہوں۔

کہیں افغانی طالبان سے کہیں ازبک یا تاجکوں سے ذرا سا کسی پر شک ہوا تو اس کے ساتھ دس بندے اور لپیٹ میں لے آتے ہیں ۔اب افغانستان کے لوگوں سے ان کے تعلقات ہی نہیں رشتے داریاں بھی ہیں ۔

کمیون یعنی دیہی اشتراکی تنظیم کا بنیادی کام علاقے میں رفاہِ عامہ کے کاموں یعنی سکول، شفاخانے ،معذور افراد کی روزی کے وسائل کی دیکھ بھال اور دیگر مسائل کے حل سے ہے ۔کمیون دراصل ایک قسم کی سیلف گورنمنٹ Self Government ہے ۔زیادہ اہمیت اقتصادی مسائل کی ہے ۔پورے مُلک میں تقریباً ساٹھ ہزار کمیون قائم ہیں ۔ ہمارے علاقے میں قائم کمیون سیاست میں گھُسی رہتی ہے ۔مقامی مسلمانوں کے مسائل کی طرف توجہ دینے کے وہ اُن کی تعداد گھٹانے اور ہُن چینیوں کو اُن پر غالب لانے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں ۔صبح سو کر اُٹھیں تو گلیوں بازاروں میں پوسٹر دیواروں پر چسپاں نظر آتے ہیں ۔میرے خیال میں اپنے شہریوں کو خوف زدہ کرنا کچھ پسندیدہ کام نہیں ۔مثبت نتائج نہیں نکلتے ۔لوگوں کی بڑی اکثریت اب اپنے تشخص، اپنی بقا اور اپنے حقوق کیلئے اپنے اپنے علاقوں میں متحد ہو کر کام کر رہی ہے ۔

صاحب خانہ نے اِس دفعہ پھر کہا دیکھو جب آپ کسی ملک میں رہتے ہیں تو اُس قوم اور ملک کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔جب انہوں نے اپنے لوگوں پر مذہب بین کیا ہوا ہے تو پھر اقلیتوں سے بھی توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے پر امن رہیں ۔آپ اُن کی دانائی اور بصیرت دیکھیے انہوں نے 2009 میں جماعت اسلامی جیسی جماعت کو نوروزہ دورے کی دعوت دی اور ہر سطح پر اُن سے مذاکرات کیئے ۔انکی باتیں سنیں اور اپنی سُنائیں ۔آپ لوگ اُن کے عملی اور غیر جذباتی ہونے کا اِسی امر سے اندازہ لگالیں ۔

اس میں شک نہیں اگر جذبائیت سے ہٹ کر دیکھیں اور تجزیہ کریں تو محسوس ہوگا کہ چین امریکہ کی طرح قطعی احسان فراموش قوم نہیں ۔ایک بار نہیں بار ہا ان کی اعلیٰ قیادتوں نے کھلے عام اس کا اعتراف کیا کہ وہ پاکستان کے احسانات کو کبھی نہیں بھلا سکتے جو اس نے ابتدائی مراحل میں دنیا اور خاص کر امریکہ کے ساتھ چین کے تعلقات استوار کرنے میں کردار ادا کیا ۔آپ اس کے برعکس امریکہ کو دیکھ لیں ۔کیسے آپ کی سرزمین کو لہو میں نہلا دیا ۔کیسے آپ کو استعمال کیا اور کیسے آپ کو پھینک کر چلتا بنا ۔پاکستانی قوم کو جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے ۔وقت بدل رہا ہے ۔آنے والا وقت چین کا ہے ۔اِس سپر پاور کی تیاری کیلئے قدرت خود راہیں ہموار کر رہی ہے ۔

میں مانتا ہوں امریکہ میں مذہبی رواداری اور احترام ہے ۔آپ مسجدیں بنائیں ،مندر بنائیں ۔میں گزشتہ سال اپنی بیٹی کے پاس نیویارک گیا ہوا تھا ۔رمضان میں کیا رونقیں تھیں ۔مسجدیں آباد اور درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے ۔ہر علاقے کے مسلمان اپنے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم کیلئے مسجدوں میں بھیجتے ہیں ۔تراویح ہوتی ہیں افطاریوں اور سحریوں کا اہتمام ہوتا ہے ۔یار لوگ باگ فٹ پاتھوں پر جہاں جی چاہے سجدہ دے سکتے ہیں ۔کوئی روک ٹوک کوئی پابندی نہیں ۔مگر یہ انکے چہرے کا ایک رُخ ہے ۔دوسرا رُخ آپ دیکھتے ہیں کتنا خوفناک اور گھناؤنا ہے ۔اِن لوگوں کے دوہرے تہرے معیار ہیں ۔کتے کے پلّے اور بلّی کے بلونگڑوں کیلئے یہ لوگ مرے جاتے ہیں مگر عراق، فلسطین، کشمیر کے مظلوموں پر ٹینک تو پیں چلیں انکی انہیں پرواہ نہیں ۔حکومتوں اور طاقتوں کے اپنے اپنے فلسفے اور اپنے عزائم ہوتے ہیں ۔

پاکستان 16-10-2011

لمحہ فکریہ

احتجاجی شعور سے عاری قوم۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

1969ء میں جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ تھی۔ایک دن کلاس اٹنڈ Attend کر کے ہوسٹل جانے کیلئے باہر سڑک پر آئی۔بھونچکی سی ہو کر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔صبح والا پُر شور اور ہما ہمی والا ماحول کہیں اُڑنچھو ہوا پڑا تھا۔سارے میں سناٹا اور ویرانی کا راج تھا۔پتہ چلا کہ ایسٹ زون کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے کسی حکم پر احتجاجی سٹرائیک ہوئی ہے۔اتنی موثر اتنی بھرپور ہڑتال۔مغربی پاکستان میں ایسی کسی ہڑتال کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا۔میرے لیے ایک نئی اور انوکھی بات۔

پھر ایسے مناظر دیکھنا معمول بن گیا۔بنگالی ایسی شعور والی قوم تھی کہ بچہ بچہ بھاشانی کے گیارہ نکات اور مجیب کے چھ نکات کے ایک ایک پوائنٹ پر بحث کر سکتا تھا۔سائیکل رکشے پر جانے کیلئے سوار ہوتی تو منزل تک پہنچنے تک وہ پوری تاریخ کھول کر رکھ دیتا۔سر تھام کر رہ جاتی۔

کبھی یہ سوچ بھی بے اختیار در آتی کہ آخر ہماری قوم کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ان میں احتجاج اور سیاسی شعور کیوں نہیں ہے؟ کیا مچھلی اور گوشت کا فرق ہے؟چالیس سال بعد سیاسی لحاظ سے تو ہم کچھ بالغ ہو گئے ہیں کہ اب سیاست تھڑوں ،حجام کی دکانوں، پکوڑے سموسے بیچنے والوں تک پہنچ گئی ہے اور وہ بلا جھجھک زبانی کلامی بخیے اُدھیڑنے لگ گئے ہیں لیکن احتجاجی شعور کی ابھی بھی حد درجہ کمی ہے۔حکومتیں کیسے کیسے لوٹ رہی ہیں۔کون کون سے ہتھکنڈے استعمال ہو رہے ہیں۔ایک ایک بات چیخ چیخ کر بتائی جا رہی ہے۔کرپشن کا طاقتور جن ڈکراتا پھر رہا ہے اور اُسے کوئی روکنے والا نہیں۔مہنگائی کے عفریت نے غریب کا جینا حرام کر رکھا ہے۔سبزی دال ہی مان نہیں۔گوشت کی تو بات کیا۔لوڈشیڈنگ کے تماشے اپنی جگہ۔زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔کہیں کوئی احتجاج کہیں کوئی شور و غل۔کچھ نہیں۔سب عافیت۔مارچ کے آواخر سے اب تک دو گھنٹے۔تین گھنٹے بعد یہ عذاب سر پر پڑتا رہا۔کبھی کبھی غصہ آتا۔ہاتھوں میں جھلتے پنکھوں والے لوگوں سے جی چاہتا کہوں کمبختو اُٹھ جاؤ۔سڑکوں پر لیٹ جاؤ۔حکمران مزے لُوٹ رہے ہیں۔چلاؤ گے تو باہر نکلیں گے۔گیس کی بندش نے کرایوں بھاڑوں میں خوفناک اضافہ کر دیا۔گیس اسٹیشنوں پر لائنیں لگوا دیں۔کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔چلو شکر کچھ سڑکوں پر آئے۔جلوس نکلے۔کچھ شنوائی ہوئی۔

کبھی انقلاب انقلاب کا نعرہ لگتا ہے۔کبھی خونی انقلاب کی آوازیں کانوں میں پڑتی ہیں۔خاطر جمع رکھیے۔ابھی کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔مستقبل قریب میں بھی کوئی امکانات نہیں۔انہی بٹوں، چٹھوں، ڈوگروں، گجروں، پیپلیوں، لیگیوں نے فی الحال دوبارہ آنا ہے۔ذات برادریوں کے تماشے لگیں گے۔چاچا بھتیجا کو ہرائے گا۔کہیں بیوی آگے آئے گی کہیں شوہر۔کہیں بیٹی کہیں بھائی۔

یاد رکھیے ایوانوں میں بیٹھنے اور مفادات کو جان سمجھنے والے بزدل اور ڈھیٹ ہوتے ہیں۔عیش و آرام میں پلنے والوں کی ڈھٹائی کا ایک واحد علاج بھرپور طاقت اور اتفاق سے احتجاج۔انقلاب انقلاب۔نچلا متوسط اور غریب طبقہ کھڑا نہ ہو جائے نعرے نہ لگائے انقلاب انقلاب۔ہمارے گھر کی بجلی بند ہو گی تو ایوان صدر میں بیٹھنے والا بھی پسینے میں نہائے گا۔وہ حقیقی انقلاب ہو گا اور وہ آئے گا لیکن ابھی انتظار فرمایئے۔

17-10-2011 پاکستان

لمحہ فکریہ

ہندوستان تشویش میں مبتلا ہے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

بھارتی خبر رساں ایجنسی کے مطابق پاکستان اور سری لنکا کے درمیان گولہ بارود کے دفاعی سودے کے منظر عام پر آنے سے بھارتی حکومتی حلقوں میں گہری تشویش اور اضطراب کا اظہار ہوا ہے۔

کیوں؟ آخر ہندوستان کو اتنی تشویش کس لیے ہے؟ دنیا کے نقشے پر سری لنکا کی وجودی صورت نیچے سے گول اور اوپر سے نوکیلے کسی نازنین کے کان میں لٹکتے چھوٹے سے بُندے کی سی ہے۔ پُرامن، صلح پسند سا یہ چھوٹا سا ملک اپنی دفاعی ضروریات کیلئے خریداری کرتا ہے تو یہ بات دیو جیسے ملک کو تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ہے نا کمال کی بات۔

دراصل ہندوستان سمندر کی اُس بڑی مچھلی کی طرح ہے جو چھوٹی مچھلیوں کو جینے کا حق نہیں دیتی ہے اور ہمیشہ ہڑپ کرنے کی خواہش مند رہتی ہے۔ وہ ایک سفاک ہمسایہ ہے جس کی آنکھ میں ہر دم اپنے قریبی ہمسائے کھٹکتے ہیں۔

تھوڑا سا پس منظر دیکھیئے۔ 1948 میں آزاد ہونے والا اور 1972 میں جمہوریہ سری لنکا بننے والا ہریالیوں میں گھرا ڈچ، برطانوی اور مسلم طرز تعمیر کی خوبصورت عمارات، گرجوں، مسجدوں اور مندروں سے سجا یہ ایک انتہائی خوبصورت ملک ہے جو چار مذاہب 69% بدھ، 15.5% ہندو ساڑھے سات فیصد عیسائی اور ساڑھے آٹھ فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

سنہالی، تامل، انگریزی بولنے والے چاروں قومیتوں کے یہ لوگ پُرامن طریقے سے رہ رہے تھے۔ جب تک ہندوستان نے تامل شرپسندوں کو اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہندوستان کے جنوبی حصے اور سری لنکا کے شمالی حصے کی تامل ناڈو (تامل ٹائیگرز) نامی تنظیم دنیا کی تشدد پسند تنظیموں میں سے ایک ہے جس کے ارکان کیلئے مرنا، مارنا، قتل کرنا اور کرانا کھیل سے زیادہ نہیں۔ ان کا اہم مقصد سری لنکا کے مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ گھنے جنگلوں میں ان کی زیر زمین پناہ گاہیں، اسلحہ خانے اور تربیت گاہیں ہیں۔ Trincomalee میں ان کا ہیڈ کوارٹر ہے اور اس تنظیم کو ہندوستان کی پوری پشت پناہی حاصل ہے۔

نوے کی دہائی کے آغاز میں سری لنکا کے شمالی شہر جیفنا JAFFNA اور مضافاتی علاقوں کے مسلمانوں کی جو تعداد کے لحاظ سے مقامی آبادی کا تقریباً 50% تھے فشنگ کے کاروبار میں بڑے با اثر تھے جیفنا کے متمول لوگوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا اُن کا کاروبار ہندوستان کے ساحلی شہروں تک پھیلا ہوا تھا۔

تامل دہشت گردوں نے گن پوائنٹوں پر صرف دو گھنٹوں کے اندر ان کے گھروں کو لوٹ کر انہیں سری لنکا کے وسطی اور جنوبی حصوں میں دھکیل دیا۔ ایسا کرنے سے اُن کا اہم مقصد ایک تو مسلمانوں کو باقی قوموں سے لڑانا، انہیں دہشت گرد قرار دینا، ان کی جائیدادوں پر قبضے کے ساتھ ساتھ جیفنا، بینا اور NILAVELI میں اپنے مزید قدم جمانا اور پورے ملک میں انتشار پھیلانا تھا۔

لُٹے پٹے سری لنکن مسلمانوں نے بہت سمجھداری اور فہم وفراست سے کام لیتے ہوئے حکومت اور دوسرے مذاہب کی ہمدردیاں سمیٹی تھیں۔ 1990 میں بے گھر ہونے والے یہ ہزاروں افراد 2001 میں مجھے کینڈی، دمبولا اور انورادھاپورہ میں ملے تھے اور اُن پر ہونے والے ظلم وستم سُن سُن کر دل خون کے آنسو رویا تھا۔

سری لنکا کے لوگ ہندوستانی چالوں کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ہندوستان کے عزائم سے اچھی طرح واقف ہیں۔نویرا ایلیہ سے آدم پیک کی طرف جاتے ہوئے مجھے وہ بُدھ ڈرائیور یاد آیا ہے جس نے کنارے پر بس کے انتظار میں کھڑی چند ہندو عورتوں کو گاڑی میں بٹھا لینے کی میری خواہش پر تلخی سے کہا تھا۔

''آپ اتنی ہمدردی مت کریں۔یہ ہندو تامل عورتیں ہیں۔گاڑی میں لفٹ لیتی ہیں اور دھماکے سے گاڑی اُڑا دیتی ہیں۔ان لوگوں نے سری لنکا کا سکون غارت کر دیا ہے۔ہندوستان ان کی پشت پر ہے۔میں جانتا ہوں میری اتنی بڑی گاڑی میں صرف آپ دو عورتیں ہیں مگر میں ایسی نیکی کے حق میں نہیں ہوں۔''

یہ بڑا ہمسایہ اپنے چھوٹے مغربی ہمسائے کو آج تک دل سے تسلیم نہیں کر سکا۔تین بار ہندوستان گئی ہوں اور تینوں بار وہاں کے کالجوں اور ادبی سیشنوں کی تقاریروں اور محبت بھرے اظہاریوں میں مصنوعی سرحدوں کے خاتمے کلچر اور رہتل کے ایک ہونے پر زور تھا۔ایک ویٹر اتھا اس میں دیواریں کیوں کھینچ گئیں۔ہمارے پاس بھی منہ توڑ جواب تھے جو ہم نے فی الفور دیئے۔پر کیا کریں۔اب کہیں کلچر کی یلغار ہے تو کہیں ڈیموں سے زمینیں بنجر بنانے پر تُلا ہوا ہے۔

سری لنکا کے لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ہندوستان کے ساتھ سری لنکا کے میچوں پر پاکستان کی سری لنکا کے لیے محبت اور ہمدردیوں پر خوش ہوتے ہیں اور آپ سے ملنے پر اس کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔

صفر سے شروع ہونے والا جمہوریت کے ثمرات سے بے بہرہ نالائق سیاست دانوں، مفاد پرست اسٹیبلشمنٹ، مارشلاؤں کے ہتھکنڈوں میں جکڑے ہوئے میرے اس ملک کی بھی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آتی۔بندہ جائے تو کہاں جائے؟

کمزور ملک گاؤں کے اُن کمی کمینوں کی طرح ہوتے ہیں جن کی ترقی یا خوشحالی کا ہر قدم نمبردار کے لیے باعث تشویش ہوتا ہے۔

پاکستان 22-10-2011

لمحہ فکریہ

ہم اور ہماری افغان سٹریٹیجک پالیسی

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

یہ غالباً چھ یا سات جون 2008ء کی بات ہے جب میں پیٹرزبرگ جانے کیلئے اپنی ساتھی کے ساتھ ماسکو ریلوے اسٹیشن پہنچی تھی۔ ویٹنگ لاونج میں سیمی سرکل میں بیٹھے پانچ مردوں پر پڑتی طائرانہ نگاہوں سے تھوڑا سا یہ اندازہ لگانے کی کوشش میں تھی کہ وہ پختون ہیں، پاکستانی یا ہندوستانی ہیں۔ بھاگم بھاگ ان کے پاس گئی۔ کھانوں کا پٹارہ کھولے بیٹھے تھے۔

اجنبی سرزمین پر مانوس سے نقش ونگاروالوں کیلئے "کہاں سے ہیں؟" جاننے کی فطری خواہش اور تجسس تھا۔ دوسرے التجا بھرے لہجے میں درخواست صرف اتنی سی تھی کہ پیٹرزبرگ جانے والی ٹرین کو پلیٹ فارم نمبر 9 پر آنا ہے۔ بس تھوڑی سی رہنمائی کردیں کہ روسی زبان میں کی جانے والی اناؤنسمنٹ Announcment ہمارے پلّے نہیں پڑتی۔

وہاں بدتمیزی کو چھوتی ہوئی عجیب سی بے نیازی ان کے انداز اور باتوں میں تھی۔ وہ سب افغانی تھے۔ نوشہرہ کے کسی گاؤں میں سکونت رکھتے تھے۔ تین سال ہو گئے تھے روس میں آئے ہوئے۔ ارے کیسے احسان فراموش سے لوگ ہیں۔ ایک تو ہمیں لوٹ کر کھا گئے ہیں۔ معاشرہ اُلٹ پُلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ دل میں ملامتی ہتھیاروں سے ان کے تکے توبنے تو ڑنے لگی تھی۔ خفیف سا اظہار زبان سے بھی ہو گیا تھا۔ چار نے تو مجھے قطعی توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ پانچویں نے کہا۔

پاکستان اور پاکستانیوں سے ہمیں بڑی نفرت ہے۔ ہم نے تو آپ کا کیا کھانا تھا آپ نے تو ہمارے نام پر پوری دنیا کو لوٹ لوٹ کر کھالیا ہے۔

میری تو بولتی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ شکستہ دم سی واپس آئی گہری کسک اور تڑپ کے ساتھ۔ وہی کسک آج پھر اُبھری ہے کہ سکرین پر کابل کے حوالے سے بڑے دل شکن سے منظر تھے۔ لوگوں کا جم غفیر کابل کے بازاروں اور گلی کوچوں میں ہاتھوں میں بینر (Banner) اٹھائے نعرے لگا تا تھا۔ پاکستان سے نفرت کے، آئی ایس آئی (ISI) سے نفرت کے۔

افغانستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینا بند کردیں۔ برہان الدین ربانی کی قاتل آئی ایس آئی (ISI) ہے۔

دوسری ایک اور خبر اس سے بھی دل شکن اور رسوا کن ہے۔

افغانستان اپنا پہلا اسٹریٹیجک معاہدہ بھارت سے کرے گا۔ امریکہ کی افواج اپنی واپسی کے بعد اپنا کردار بھارت کو سونپنے کا فیصلہ کر بیٹھی ہیں۔ حامد کرزئی دہلی کا دورہ کررہے ہیں۔ افغان نیشنل سیکورٹی فورسز کو تربیت افغان پولیس اور سیکورٹی میں بھی نئی تبدیلیاں بھارت کے تعاون سے لائی جائیں گی۔

کیا وہ شعر حسب حال ہوگا کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ ہرگز نہیں۔

ہماری غلطیاں، ہماری کوتاہیاں اور خود غرضیاں ہمیں یہ دن دکھارہی ہیں۔

کوئی ملٹری اسٹیبلشمنٹ Military Establishment سے پوچھے کہاں گئیں آپ کی وہ سٹریٹیجک گہرائیوں کی پالیسیاں؟

آپ نے تو سچی بات ہے جنگ جوؤں کے ٹولے بنائے، کہیں Soft Image دینے کی توفیق نصیب نہ ہوئی آپ کو۔ کوئی مدرسہ، کوئی شفاخانہ، کوئی پُل، کوئی سڑک، کوئی ویلفیئر پروجیکٹ۔ پراکسی وار کے ذریعے کنٹرول کی کٹھن گھمبیریوں میں اُلجھے رہے اور ابھی بھی اُلجھے ہوئے ہیں۔ اتنے Short sighted ہیں کہ سٹریٹیجک پرزم Strategic Prism میں سے صرف ایک ہی رنگ کو فوکس کرتے رہے کوئی دوسری سوچ، کوئی دوسرا پہلو، کوئی اور رنگ نہ

سیاستدانوں اور نہ کسی ہی اور کو نظر آیا۔

ہمارے ذہنی اُفق ہی اتنے محدود ہیں کہ وہ ان دائروں سے جو ہم نے کھینچ لیے تھے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ بدقسمتی یہ کہ اگر پچھلے ادواروں میں یہ سوچ حاوی رہی تو جب امریکہ اپنا ہدف پورا کرنے کے بعد ہمیں اور جنگجوؤں کو چھوڑ کر نکل گیا تو پھر انہیں کوئی دوسرا مثبت راستہ دکھانے کی ضرورت تھی۔ 9/11 کے بعد جب Dimensions بدل گئی تھیں۔ دنیا کا سنیریو Scenario چینج ہو رہا تھا ہمیں سوچنا تھا۔

مگر یہ سوچ اور غور وفکر والے کام تو ہم نے کرنے ہی نہیں۔

ہمارے تو مانے پر دانے لیڈر بھی ذاتی اغراض سے آگے نہیں دیکھتے۔ ڈھاکہ مذاکرات کیلئے جانے والے لیڈروں کی ٹانگیں توڑنے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔

اور اب بھی دیکھیے ان کی ہی آل اولادیں بلوچستان کو کس بُری طرح نظر انداز کر رہی ہیں۔ اے پی سی (APC) میں بلوچستان کے کتنے نمائندے شامل ہوئے؟ بلوچستان کیوں نظر انداز ہو رہا ہے؟ کیوں وہاں نہیں جاتے؟ ان کے ساتھ کیوں نہیں مکالمہ ہو رہا ہے؟ ان کے گلے شکوے ان کی شکایات۔ وہاں لا اینڈ آرڈر (Law and order) کی صورت کیوں توجہ نہیں کھینچ رہی؟ ہم شیشے کے گھروں سے کب نکلیں گے؟

میرے خدایا یہی صورت کبھی مشرقی پاکستان میں بھی تھی۔

پاکستان 25-10-2011

لمحہ فکریہ

ریلوے کی تباہی میں ریلوے ملازمین کا کردار۔
مریم گیلانی کی مثال اپنائیں۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

2007ء میں پٹیالہ یونیورسٹی کی ایک لٹریری کانفرنس Literary Conference کیلئے انڈیا گئی۔واپسی پر امرتسر ٹھہرنے اور گولڈن ٹمپل Golden Temple دیکھنے کی خواہش پر امرتسر کالج کی پروفیسر مسز مدھو ورما نے مجھے اور نیلم احمد بشیر کو اپنے گھر قیام کی دعوت دی۔امرتسر ریلوے کالونی میں یہ چھوٹا سا دو کمروں کا ایک اپارٹمنٹ تھا۔اشوک ورما ریلوے میں سولہویں گریڈ کا ملازم تھا۔گھر میں سادگی اور قناعت کا راج تھا۔رات کو باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ورما صاحب کے والد بھی ریلوے میں ملازم تھے اور اب وہ اپنے بیٹے کو اسی محکمے میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ان کے لب ولہجے میں ریلوے سے چھلکتی محبت تھی فخر کا سا احساس تھا جب وہ بولے ۔تقرریاں کرتے وقت ہم ملازمین کے بچوں کو ترجیجی فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ہم اپنے محکمے کو own کرتے ہیں۔اُن کی باتوں سے اُس وقت میرے دل پر جیسے گھونسا سا پڑا۔

''اللہ ہم کتنی بدقسمت قوم ہیں۔کسی چیز کو اپنا نہیں سمجھتے۔لوٹ لینے کے درپے ہیں۔''

آج جب ریلوے اپنے بدترین حشر کے ساتھ کھڑی ہوگئی ہے مجھے مسٹر اشوک ورما یاد آئے ہیں۔

مجھے اس پر ابھی قطعی بحث نہیں کرنی کہ ریلوے وزیر غلام احمد بلور کس درجہ احمقانہ بیان دے رہے ہیں۔شیخ رشید نے اپنے دورِ وزارت میں ریلوے کی کتنی خدمت کی جو وہ آج ریلوے کے غم میں دھرنا دینے کی بات کرتے ہیں۔ڈیزل کی کمی کے باعث 114 ٹرینیں منسوخ ہوگئی ہیں جبکہ ریلوے کے پاس پسنجر ٹرینیں Passenger Trains تقریباً 220 کے لگ بھگ تھیں۔ پورے پاکستان میں مال گاڑیاں بھاگی پھرتی تھیں اور اب ریلوے کے تقریباً نوے ہزار ملازمین تنخواہیں نہ ملنے کے باعث پریشان ہیں اور آج کے اِس پرآشوب دور میں انہیں روٹی کے لالے پڑ گئے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ریلوے ایک مکمل ادارہ ہے جس کا اپنا بجٹ ہوتا تھا۔اپنا وزیر اور پورے پاکستان میں اس کی اپنی اراضی، اپنی کیرج ورکشاپ،لوکوشاپ، ڈیزل ورکشاپ،سلیپر فیکٹریاں،اپنے اسپتال،اپنے سکول،جنرل سٹور ایک سٹیٹ ہے ریلوے کے پاس۔اس کے ملازمین جو آج راستے بلاک کررہے ہیں،احتجاجی جلوس نکال رہے ہیں۔اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں انہوں نے ریلوے کو کتنا اون own کیا۔جو بندہ جس جگہ تھا اُس نے اسے لوٹا۔ڈیزل چوری ہوتا تھا،زمینوں پر قبضے،سکریپ کی فروخت،پٹڑیوں کو اُکھاڑ کر بیچا۔بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا اور خاندان جن کیلئے مراعات تھیں ان کے علاوہ محلّے والے بھی مفت سفر کرتے تھے۔سوچنے کی بات ہے ریلوے کن لوگوں کی سواری ہے۔عوامی سواری،غریب اور متوسط لوگوں کی۔وزیروں اور امیروں نے کب اِسے گھاس ڈالی جو ذرا قد آور ہوا اُسے تو جہاز پر چڑھنے کا شوق ہوا۔ایک آدھ مثال کے سوا کہ ضیاء الحق بیٹے کی بارات بوگی میں لے کر ملتان گئے تھے۔شاید یہ بھی لوگوں کو امپریس Impress کرنے کا ایک انداز تھا۔

سری لنکا میں کولمبو سے کینڈی جانے کیلئے میں اور میری دوست گاڑی میں سوار ہوئے۔دنیا کے نقشے پر آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو کے قطرے جیسا ملک ایک خوبصورت ریلوے کا حامل تھا۔پتہ چلا تھا کہ گاڑی میں چند کوچز پاکستانی میڈ Made ہیں۔کس قدر خوش ہوئے۔نہال ہوجانے والی بات تھی۔بعد میں پتہ چلا

تھا کہ اسلام آباد میں جدید گیرج فیکٹری بنائی گئی تھی جہاں پسنجر کوچز بنتی تھیں اور کئی ملکوں کو بھیجی جاتی تھیں۔

اپنے حقوق کیلئے ہم لوگ کتنے کوشاں ہوتے ہیں۔ یونین بنتی ہیں۔ جب لوٹ مار کے بازار گرم تھے کوئی ایسا نہیں تھا جو آواز اُٹھاتا تحریک چلاتا کہ ریلوے ہمارا ہے یہ غریبوں کا ہے۔ ٹرانسپورٹ مافیا اس کی تباہی کے درپے ہے۔ مال برداری سسٹم پرائیویٹ سیکٹر Private Sector کو منتقل ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مافیا اور ٹرانسپورٹرز کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ حکومت بھی معافی کی مستحق نہیں۔ ریلوے اپنے اثاثوں کے ساتھ ایک مالدار محکمہ ہے۔ اس کے کلب کنالوں میں پھیلی اس کی کوٹھیاں سب بیوروکریسی کیلئے بہت پُرکشش تھیں اور ہیں۔

مریم گیلانی کی مثال ہمارے سامنے نہیں ہے۔ نازک سی دھان پان سی لڑکی کیسے کرپشن کے خلاف ڈٹ گئی اور ابھی بھی ڈٹی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنا لیڈر بنائیں۔

اب کیا ہو۔ جیسا سوال سامنے ہے۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ جس طرح لوگ تنخواہوں کیلئے گھروں سے نکلے ہیں اسی طرح ریلوے بچاؤ کا نعرہ لگاتے ہوئے نکلیں۔ کوئی تحریک کبھی اُوپر سے نہیں اُٹھی، ہمیشہ نیچے سے محروم لوگوں کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ ریلوے ہمارا ہے ہم اس کے محافظ ہیں۔ ہمارے کاریگر اس کے انجنوں کو ٹھیک کریں گے۔ ورکشاپس میں کام کریں گی۔ وقت کی پابندی ہوگی۔ ہر بندہ ایمان داری کے چلن کو اپنائے گا۔ کسی بڑے کو بے ایمانی کی اجازت نہیں دیں گے۔ کرپٹ افسروں کا محاسبہ ہوگا۔

اب ظاہر ہے ان بدترین حالات میں حکومتی سطح پر کچھ تو ہوگا۔ گرانٹ دی جائے گی اور حالات کو سنبھالا دینے کی اپنی سی کوشش ہوگی مگر دوبارہ لوٹ مار کا بازار گرم ہوگا یا نہیں یہ طے کرنا ضروری ہے۔ آخر ہم ہر بات حکومت پر کیوں ڈالتے ہیں۔ کچھ کام ہمارے کرنے کے بھی تو ہیں۔ تو اپنے حصے کا کام کیجیے۔ مخلص اور ایماندار لوگوں کو خود میں سے ڈھونڈیے۔ انہیں اکٹھا کیجیے۔

تو جب عوام متحد ہوگی تو کوئی بے ایمانی نہیں کر پائے گا۔ ریلوے کو بچانا ریلوے ملازمین کے ہاتھوں میں ہے۔ آگے بڑھیں اور اسے بچائیں۔

30-10-2011 پاکستان

لمحہ فکریہ۔

عمران خان ایک نئی اُمید

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

جس دن عمران خان مینارِ پاکستان پر اپنا جلسہ کر رہا تھا ہم چند رائٹر خواتین و مرد مشہور ڈرامہ نگار و ناول نگار ڈاکٹر یونس جاوید کے گھر رات کے کھانے پر مدعو تھے۔میرے بیٹے اور بھتیجے جب ظہر کے بعد جلسے میں جانے کیلئے تیاریوں میں لگے تو ماں ہونے کے ناطے میں نے گھبرا کر کہا۔

''اللہ تعالیٰ اپنا کرم کرے۔مت جاؤ۔حالات کا کچھ اعتبار نہیں۔''

''لو میرے بڑے بیٹے نے ہنس کر کہا۔میرے دفتر کا پورا عملہ بمعہ میرے کراچی کے ایم ڈی کے جلسے میں جا رہے ہیں اور آپ فرماتی ہیں مت جاؤ۔اب عمران کو سپورٹ کرنے کا وقت ہے۔''

اب دعائیں ہونٹوں پر رکھیں اور نیلم احمد بشیر کو لینے اُس کے گھر پہنچی۔نیلم کی چھوٹی بیٹی امریکہ کی جم پل، وہاں کی پوسٹ گریجویٹ، لاہور کے امریکن اسکول میں ملازم اپنی پندرہ سہیلیوں کے ساتھ گاڑیوں میں لدلدا رہی تھیں جلسے میں جانے کیلئے۔نیلم کھڑی انہیں رُخصت کر رہی تھی۔

سچی بات ہے۔یونس کے ہاں جانا نہ ہوتا تو ہم بھی ساتھ چلتے۔وہ تاسف سے بولی۔

میں نے اِس منظر سے تقویت اور حوصلہ پکڑا۔

لڑکیاں نعرے لگا رہی تھیں۔عمران خان کو لانا ہے باقی سبھوں کو بھگانا ہے۔

کیا جوش و جذبہ تھا۔

اِنہیں دعاؤں کے ساتھ رُخصت کرکے یونس کے گھر کیلئے روانہ ہوئے۔راستے میں پروین عاطف کا فون تھا۔

گاڑی کا رُخ بدلو۔مجھے لو اور جلسے میں چلو۔

بھئی یونس نے بہت خرچ کیا ہوگا۔بُری بات۔

نیلم چلو ذرا چکر لگائیں گلبرگ اور ڈیفینس کا۔ذرا لوگوں کے حال احوال کا جائزہ لیں۔مارکیٹیں کو بند تھیں مگر کافی بُوس شاپس اور ریسٹورنٹوں میں خاصا رش تھا۔لبرٹی کے گول چکر میں لوگوں کے پُرے گھومتے تھے۔

تقریباً پچیس خواتین میں سے صرف تین مسلم لیگ ن اور دو پی پی کے حق میں بولیں وگرنہ ہر ایک با آواز بلند تھیں۔آزمالیا ہے سب کو۔اب نئے چہروں کو خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں۔ایماندار آدمی ہے سچا ہے کھرا ہے۔منافق نہیں۔مُلک کو ایسے آدمی کی ضرورت ہے۔

یہ خاندانی پاور وراثتی سیاستیں ختم ہونی چاہئیں۔زچ آگئے ہیں۔پہلے بھٹو صاحب پھر بیٹی پھر داماد اب نواسا۔بلاول سے کہیں اچھے ٹیلنٹڈ لڑکے اِس مُلک میں موجود ہیں۔اُسے کیا سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں۔متوسط اور غریب طبقے کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔جب تک میرٹ نہیں ہوگا یہ مُلک ترقی نہیں کر سکے گا۔

یونس کے گھر پہنچے۔معروف شاعرہ رخشندہ نوید کو فون کر رہے ہیں۔پتہ چلا کہ چاروں بیٹیاں جلسے میں پہنچی ہوئی ہیں۔سب سے بڑی دو سالہ بیٹے کو گود میں اُٹھا کر چلی گئی ہے۔یونس کے ڈرائنگ روم میں لکھاریوں کا ٹولہ جمع تھا جن کی اکثریت ٹی وی پر انسانوں کا ہجوم دیکھتے ہوئے قیاس آرائیوں میں جُتی ہوئی تھی۔

بھٹو کی آمد بھی ایسے ہی ہوئی تھی ۔سیاسی اُفق پر وہ دھماکے کی مانند طلوع ہوا تھا۔
پی پی کے حامی ایک سینئر رائٹر نے کہا۔
عمران کے پاس ٹیم کہاں ہے؟
پروین عاطف جوش سے بولی ۔بھٹو کے پاس ابتداء میں کب ٹیم تھی ۔لوگ باگ بعد میں شامل ہوتے گئے ۔بہت سارے ناموں کو کوئی جانتا تک نہیں تھا۔
خوش آئند بات جو حوصلہ دیتی ہے وہ نوجوان نسل ہے ۔اٹھارہ سال اور اُس سے اُوپر کی جدید تعلیم یافتہ نسل جو انقلاب کی خواہاں ہے۔
پریکٹیکل اور خوبصورت بات مسز یونس جاوید کی تھی جنہوں نے کہا کہ عمران نے اپنی طاقت کا شو آف کر دیا ہے اب آگے کے مرحلے جان توڑ ہیں۔
تحریک اِسی جوش و جذبے سے پورے مُلک میں پھیلائی جائے ،رضا کار نوجوانوں کی ٹیمیں بنیں ۔ایسے پڑھے لکھے اور سماج سُدھار لوگوں کا انتخاب ہو ۔پُرانے آزمودہ کرپٹ لوگوں کو کسی طور پارٹی میں شامل نہ کیا جائے ۔تعلیم ،صحت ، معاشی ترقی اور روزگار کے بنیادی مسائل اگلے پانچ سالوں کی ترجیح ہونی چاہیے ۔بہت سارے پنگوں کی بجائے دھیرے دھیرے فوری توجہ طلب مسائل حل ہوتے جائیں ۔کرپشن کا مسئلہ حل ہونے میں وقت لگے گا۔تعلیم عام ہوگی تو شعور بڑھے گا۔
یقیناً عمران خان آنے والے وقت کا ایک کامیاب لیڈر ہوگا۔

پاکستان 11-11-2011

لمحہ فکریہ

انڈیا The most favourite nation

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

غالباً یہ 2004ء کی بات ہے کہ مجھے ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ پنجاب کے سابق وزیرِاعلیٰ جناب پرویز الٰہی کی سرکردگی میں پٹیالہ اور چندی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ یہ دعوت بھارتی پنجاب کے وزیرِاعلیٰ کیپٹن مہندر سنگھ کی دعوت پر تھی۔

ادیبوں اور فنکاروں کا وفد وزیرِاعلیٰ کے جانے سے دو دن قبل روانہ ہوا۔ پہلا پڑاؤ امرتسر ہوا جہاں رات کو کلچرل شو اور ان کے کسی وزیر کا ایڈریس تھا۔

کلچرل شو کی خوبصورتی اور پنجاب کے رہتل کی سچی عکاسی نے اگر دل خوش کیا تو وہیں ایک ویٹر ے کے دو ہو جانے پر دُکھ کے اظہار تھے۔ وزیر کی تقریر میں ویزے کی سختیوں کو نرم کرنے اور تجارتی سرگرمیوں کو تیز کرنے پر زور تھا۔

''دیکھیے نا پنجابی میں ان کا بے تکلفانہ اور کھلا ڈلا اظہار تھا۔ آپ کو گندم کی ضرورت ہے۔ آپ لوگ سائیکلوں پر امرتسر آئیں۔ کیرئیر پر بوری رکھیں اور لے جائیں۔ آپ کو چینی کی ضرورت ہے۔ پیاز اور آلوؤں کی۔ کوئی چنتا نہیں۔ درمیان میں فاصلہ ہی کتنا ہے؟

ساری ضرورتیں پاکستان کی۔ سب چیزوں کی فراہمی کا وعدہ۔ مگر انڈیا پاکستان سے کیا لے گا؟ اس کا کہیں ذکر نہیں۔ آخر پاکستان نہ بنجر زمین ہے اور نہ یہاں ماہرین کی کمی ہے مگر سارے خطاب میں ایک برتری، احساسِ تکبر ہمدردی کے لبادے میں لپٹا محسوس ہوتا تھا۔

خوش قسمتی سے میرے ساتھ کی سیٹ پر ایک سکھ براجمان تھے جنہوں نے خوش دِلی سے ذرا اُونچی آواز میں کہا۔

سردار جی پاکستانی پنجاب تو ہمارا مکہ مدینہ ہے اور پھر وہاں بریزے اور لون چکن کے سوٹ ہیں جن کیلئے ہندوستانی عورتیں مرتی ہیں۔ بچی کیلئے تو لانے ہی ہوتے ہیں پر رشتہ کی عورتوں کی فرمائشوں کی پوری لسٹ ہوتی ہے۔ میں نے خوش ہو کر ان کی طرف دیکھا وہ کینیڈا میں سیٹل Settle تھے۔ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کیلئے پاکستان گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر اپنے رشتے داروں کیلئے کوئی تین لاکھ پاکستانی روپے کے بریزے کے نیٹ اور شیفون کے سوٹوں سے اٹیچی کیس بھر کر لائے تھے اور میرے پاس بیٹھے کہہ رہے تھے کہ میں نے لبرٹی والوں کو کہا ہے کہ دلّی میں دوکان کھولو۔ ہماری عورتیں بریزے کی دیوانی ہیں مگر مجھے پتہ چلا کہ ہندوستان حکومت نے اتنی شرائط پیش کیں کہ مالکان خاموش ہو گئے۔

چلو اُس وقت میرے جلتے تپتے جذبات پر پانی کے چھینٹے پڑ گئے کہ ہم کسی سے کم نہیں۔

یہ 2004ء کی بات تھی جب حالات اتنے المناک نہیں تھے۔ بجلی کا گھمبیر مسئلہ نہیں تھا۔ سوئی گیس اور سی این جی ہمہ وقت دستیاب تھیں۔ مہنگائی اس حد تک نہیں تھی۔ پاکستان کے مانچسٹر فیصل آباد کے کارخانے کام کرتے تھے۔ ریلوے کی حالت اتنی پتلی نہ تھی۔ غرضیکہ معیشت داؤ پر نہیں لگی ہوئی تھی۔ اب تک تو پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے، ادارے تباہ و برباد ہو گئے ہیں اور ایک نا اُمیدی، شکستگی پورے مُلک پر چھائی نظر آتی ہے جس میں گونجتی آوازیں ہندوستان کے ساتھ اُس کی من مانی شرائط کو قبول کرنے پر اُکساتی ہیں۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

جذباتی نعروں کی بجائے حقیقت پسندی کی طرف آنے کی ضرورت ہے۔ خود کو مضبوط کرو اور کاروباری اوصاف پر پورا اُترو۔

یہاں ہمیں اپنا جائزہ لینا ہے۔

پہلے دو واقعات کا ذکر کروں گی۔ایک قدرے پُرانی پڑھی ہوئی بات ہے دوسری حال کا ذاتی تجربہ۔

کسی جاپانی صنعتکار سے سوال کیا گیا کہ آپ پاکستانی اور ہندوستانی ٹریڈ آفیشلز Trade officials کو کس اینگل Angle سے دیکھتے ہیں اور دونوں میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔

اُس کا جواب تھا۔ہندوستانی ٹریڈ آفیشل کوالٹی کے بارے میں بہت الرٹ ہوتا ہے وہ ہر طرح کی تسلی چاہتا ہے۔اُس کے تمام پہلو اُس کے سامنے ہوتے ہیں۔نہ وہ کوالٹی پر سمجھوتا کرتا ہے اور نہ مقدار پہ۔کہیں آخر میں دبے لفظوں میں وہ اپنے کمیشن کی بات کرتا ہے جبکہ پاکستانی سب سے پہلے اپنے کمیشن کا پوچھتا ہے۔چیز کی کوالٹی اور باقی امور اُس کی ترجیحات نہیں۔

اب دوسری سُنیئے۔

سبزی منڈی میں تازہ اور صحت مند ٹماٹروں کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی کہ لہجے میں تعجب کا اظہار تھا۔دوکاندار نے بتایا کہ انڈیا سے آئے ہیں۔جناب پیٹی کھولیں تو جیسا ٹماٹر اُوپر ہوگا ویسا ہی آخری تہہ میں ہوتا ہے۔ہماری طرح نہیں اُوپر اچھا اور نیچے گلا ہوا مال۔

تو یہ ہمارا قومی کردار ہے۔

اب انڈیا کے ساتھ تجارتی معاملات میں ہم یقیناً مار کھائیں گے اور مقابلے کی فضا پیدا ہونے کا تو موقع ہی نہیں ملے گا کہ ہمارے ہاں تو ہر چیز مہنگی اور کمیاب ہو رہی ہے۔

پہلی ضرورت اسے بدلنے کی ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ پاکستان کے گلے پر امریکہ کا انگوٹھا ہے کہ ہندوستان کو پسندیدہ ترین مُلک قرار دو کہ ایسا کرنا امریکہ کی مجبوری ہے کہ اب اُسے ایشیا کی مارکیٹ کو قابو کرنا ہے اور ظاہر ہے ایک بہت بڑے مُلک کی حیثیت سے انڈیا امریکہ کیلئے مارکیٹ کے لحاظ سے کتنا اہم ہے۔دوسری مجبوری افغانستان کے راستے وسط ایشیا کی منڈیوں تک جانے کیلئے بھی پاکستان کس قدر اہم مُلک ہے اُس کا اندازہ بھی سبھوں کو ہے۔

تو ضرورت ہے اچھی قیادت کو لانے کی۔اپنے کردار درست کرنے کی۔ اپنے قومی وقار کو بحال کرنے کی۔اپنے مفادات سمجھنے کی۔اُن پر کھڑے ہونے اور سٹینڈ لینے کی۔خدا پاکستان کے سربراہوں کو بصیرت دے۔

پاکستان 11-12-2011

لمحہ فکریہ

کراچی آرٹس کونسل کا کامیاب چوتھی عالمی اُردو کانفرنس منعقد کرنے کا اعزاز

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

کراچی ہم سب کا عروس البلاد، پاکستان کی شہ رگ ،روشنیوں اور رنگوں کا شہر۔ یہ خون میں نہانے لگا ۔خوف وہراس میں جینے لگا۔اس کے گلی کوچوں میں گولیاں چلتیں اور لاشیں گرتیں تو ہر پاکستانی کا دل دہل جاتا ہے۔پروردگار منی پاکستان کو کس کی نظر لگ گئی ۔برداشت،رواداری کا عنصر زندگیوں سے کیوں نکل گیا۔تو ایسے میں یقیناً وہ لوگ مبارک کے مستحق ہیں جو آرٹ، ثقافت، کلچر،تہذیب وتمدن والے اس شہر کواس کی رعنائیاں لوٹانے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں ۔خوف سے بھرے شہر میں بزمِ اُردو سجانے ،دُور دراز کے مُلکوں سے دانشوروں کوبُلانے اور شہر کے لوگوں کو مل بیٹھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں ۔

کراچی آرٹس کونسل کے صدر جناب احمد شاہ،ان کے سبھی رفقاء کار،مبین مرزا جیسے نوجوان اور سحر انصاری جیسے بزرگ دانشو راور شاعر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے تمام خطرات اور اپنے محدود وسائل کے باوجود مسلسل چار دن علم و ادب کی قندیلیں جلائیں۔22 نومبر سے 25 نومبر تک ہونے والی اس کانفرنس میں انگلینڈ،امریکہ،انڈیا، بنگلہ دیش ،ترکی اور پاکستان کے شہروں سے اُردو کے نامور ادیبوں، دانشوروں ،شاعروں اور موسیقاروں نے شرکت کی ۔

محمد احمد شاہ پارے کی طرح متحرک شخصیت ہیں ۔پاؤں میں جیسے پہیے لگے ہوئے تھے ۔ایک ایک بات کا جائزہ لیتے ۔ابھی سٹیج پر ہیں ابھی باہر ورکروں کے ساتھ بیٹھے انتظامات کے بارے میں پوچھ رہے ہیں ۔

کراچی کی سرکردہ علمی و ادبی شخصیات ڈاکٹر قاسم پیرزادہ، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل الدین عالی ،ڈاکٹر جمیل جالبی ،زہرہ نگاہ، فاطمہ ثریا بجیا، رئیس فاطمہ، اعجاز احمد فاروقی، ڈاکٹر احمد ہمیش اور بہت سارے دیگر اُن کی بھرپور معاونت کیلئے اُن کے ساتھ تھے ۔

ہر دن میں چار سیشنوں میں کہیں میر کہیں غالب کہیں فیض کے حوالوں سے جدید تحقیق کے نئے نئے پہلو، نئے نقاط اور نئی باتیں سامنے آئیں۔ہندوستان سے آنے والے ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے میر پر جدید تحقیق کے حوالے سے بہت معلومات افزا باتیں کیں ۔ڈاکٹر شمیم حنفی اور نوجوان ادیب اور دانشور جناب مبین مرزا،مسعود اشعر ،ملتان زکریا یونیورسٹی کے ڈاکٹر عابد قاضی کے اکیسویں صدی میں اُردو فنکشن پر پُرمغز مقالے یقیناً بہت معلوماتی اور سوچ وفکر کے نئے دریچے وا کرتے تھے ۔فاطمہ حسن اور شاہدہ حسن کی نظامت خوبصورت تھی ۔

افتتاحی اجلاس 22 نومبر بوقت سہ پہر شروع ہوا۔سٹیج پر لاہور سے بمعہ جناب انتظار حسین کراچی کی سربرآوردہ شخصیات جلوہ افروز ہوئیں ۔آرٹس کونسل کے صدر احمد شاہ نے اُردو کو سرکاری زبان کے طور پر فعال کرنے کی اپیل کی ۔اُن کا کہنا تھا کہ اُردو کا علاقائی زبان سے کوئی جھگڑہ نہیں۔علاقائی زبانوں کی سرپرستی بہت ضروری ہے مگر سرکاری زبان کو اس کا جائز مقام ملنا بھی بہت اہم ہے ۔اُردو کو نصاب کا حصہ بنانے کی قرارداد ہر سال منظور کی جاتی ہے ۔اُنہوں نے اپنے خطاب میں ایسی کانفرنسوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی ۔

اُنہوں نے اس بات پر خصوصی زور دیا کہ ادارے مضبوط ہونے چاہئیں۔شخصیات کے گرد انہیں نہیں گھومنا چاہیے ۔میں آج بحیثیت صدر کام کر رہا ہوں ۔کل ضرور چاہوں گا کہ کوئی اور یہاں میری جگہ کھڑا ہو اور میں کسی پچھلی نشست پر کاروائی دیکھ رہا ہوں ۔

باہر کے مُلکوں سے آنے والے اور مقامی لوگوں کی رائے کے مطابق اِن کانفرنسوں کا انعقاد جس انداز میں یہ آرٹس کونسل کر رہی ہے حکومتی سطح پر اِس طرح کا انداز نظر نہیں آتا ۔

ایک خوبصورت پہلو اِس کانفرنس کا یہ بھی تھا کہ ایک شاندار میوزک فیسٹیول کا اہتمام بھی تھا۔ ہر روز شام کو موسیقی کی محفل سجتی اور اوپن ائر Open Air میں راگ و رنگ میں رات نہاتی چلی جاتی۔ سجاد علی نے اپنے فن کا جادو جگایا۔ آخری دن راحت فتح علی خان کے ساتھ مخصوص تھا۔

کراچی آرٹس کونسل کراچی کے شہریوں کیلئے ایک خوبصورت تحفہ ہے جو ادب و ثقافت کی بار آوری کیلئے کام کر رہا ہے۔ اِسے 1948ء میں قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر عصمت رحیم، جناب ایڈ ورڈ سڈران، جناب آغا اے حمید، جناب جلال الدین احمد، جناب اے آر آفریدی، جناب ایس امجد علی، جناب جی احمد نے اس کی تکمیل میں اپنا حصّہ ڈالا۔ آرٹس کونسل کی جگہ محترمہ عطیہ فیضی کی ملکیت تھی۔ الطاف گوہر کی کاوشوں سے اِسے حاصل کیا گیا۔ صاحب علم و فن سے محبت رکھنے والے لوگوں نے موجود خوبصورت عمارت کی تعمیر میں دلچسپی لے کر کراچی کو خوبصورت تحفہ دیا۔

تھیٹر کے فروغ کیلئے 435 نشستوں کا خوبصورت ہال بھی تعمیر ہوا جو تھیٹر کیلئے بہت کام کر رہا ہے۔

فن مصوری کیلئے بھی آرٹس کونسل میں آرٹ گیلریاں ہیں۔ یہ ادارہ بغیر کسی منافع کے ایک منتخب باڈی کے تحت کام کر رہا ہے۔ ہر سال 5 عہدہ داران اور 12 گورننگ باڈی کے ممبران کا انتخاب ہوتا ہے۔ تقریباً 5000 ممبران ووٹ ڈال کر صدر اور ممبران کا انتخاب کرتے ہیں۔

میرے لیے باہر کے ملکوں کے ثقافتی مراکز کو دیکھنے کے بعد کراچی کی اِس آرٹس کونسل کو دیکھنا، اس میں علمی و ادبی سرگرمیوں کو جاننے اور پُر مغز مقالے سُننا دلچسپ تجربہ تھا۔ سیشنوں Sessions کی طوالت نے کہیں بوریت نہیں ہونے دی۔

پاکستان 15-12-2011

لمحہ فکریہ

آج سولہ دسمبر ہے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

آج سولہ دسمبر ہے۔وہ دن جب میرے مُلک کا مشرقی بازو مجھ سے جُدا ہوا۔ایک گھاؤ ہر حساس پاکستانی کے دل پر لگا،اُنکی آنکھوں سے آنسو نہیں خون بہے۔آیئے آج کے دن میں اپنی کچھ یادیں آپ سے شیئر share کروں۔میں جو 1969ء اور 1970ء کے دنوں میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔

ریس کورس روڈ پر ڈھاکہ کلب مسکراتا ہے۔کارڈ روم سے باہر آکر یہاں سیڑھیوں پر ٹھہر کر ایک ٹک میں نے ماحول کے سحر کو دیکھا ہے۔نیلگوں مدھم روشنی میں ڈوبے لاؤنج میں میزوں کے گرد بیٹھے خوش پوش لوگ پینے پلانے اور خوش گپیوں میں مگن ہیں۔چاق و چوبند بیرے سروس کے لیے مستعد ہیں۔اندر ایک انجانے پُراسرار سے گیت کی دُھن مدھم سروں میں بج رہی ہے۔میری واقف بنگالی فیملی پورٹیکو کے قریب کھڑی کچھ لوگوں سے محو گفتگو ہے۔میں قریب پہنچتی ہوں۔کوک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں پکڑے مسز خان سے باتیں کرتا وہ لمبا تڑنگا نوجوان مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

''لاہور خوبصورت جگہ ہے میں وہاں گیا تھا۔''

''اچھا''۔میں کہتی ہوں۔

''میں نے واہگہ سیکٹر میں شہدا کی یادگاریں بھی دیکھی ہیں۔''میں نے پھر مختصراً ''اچھا'' کہا ہے۔

بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں کا یہ پیغام پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ۔''عزیز ہم وطنو!جب آپ پاکستان کے مختلف علاقوں میں جائیں تو ہمارے بارے میں یہ بتلانا نہ بھولیں کہ ہم نے اپنا آج آپ کے کل کے لیے قربان کر دیا ہے۔''

میں دلچسپی اور اشتیاق سے اس کی طرف دیکھتی ہوں اور پوچھتی ہوں۔''تو پھر آپ یہ پیغام لوگوں کو بتا رہے ہیں نا۔''

''او ہو نہیں''۔وہ کندھے اُچکاتا ہے۔گردن سے کہیں نیچے پہنچے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔''میں دراصل اس وقت ام۔ای۔چ۔ی۔ور تھا۔بلوچ رجمنٹ ہمارے لیے نہیں ویسٹ پاکستان کے لیے شہید ہوئی تھی''۔

میں نے ہونٹوں کو سی لیا ہے کہ اس شاندار عمارت میں جہاں صرف قہقہے ہی سُنائی دیتے ہیں۔اُونچے اُونچے بولنا اور سیاسی بحثیں کرنا بے حد معیوب خیال کیا جاتا ہے۔میری آنکھیں گیلی ہیں کہ میرا بس اُن پر ہی ہے۔

میری رُوم میٹ Room mate بینو مجھ سے کہتی ہے ''تم نے سُنا ہے۔شری متی اندرا جی نے کہا ہے۔جنت میں فرشتے کیوں لڑتے ہیں۔''

میں نے رنج سے اُسے دیکھا ہے اور سر جُھکا لیا ہے۔باہر آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔بنگلہ اور اُردو پر جھگڑا ہو گیا ہے۔مسلمان کا گلا مسلمان کاٹ رہا ہے۔

مجھے دربان پیغام دیتا ہے کہ آپ سے ملنے کوئی آیا ہے میں نے حیرت سے سوچا ہے کہ اس قیامت کے سمے کون ہو سکتا ہے۔ریسیپشن رُوم Reception room میں تیرہ چودہ سالہ لڑکا مجھے نظر آتا ہے جو کہتا ہے ''میری ماں آپ کے ساتھ پڑھتی ہیں مسز نیلما ابراہیم، انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ میں آپ کو یہ دے آؤں۔معلوم نہیں ہال میں آپ کو کھانے کو کچھ ملا ہے یا نہیں۔''میں لفافے کو بغور دیکھتی ہوں،میرے سینے میں جذبات کا طوفان اُمنڈا ہے۔باہر اور اندر کا یہ تفاوت

میرے حساس ذہن کے ٹکڑے کر گیا ہے۔ میں نے اُمنڈتے آنسوؤں کو پی لیا ہے، پر میرا جی چاہا کہ میں اس خاکی لفافے کو سارے ڈھاکے میں گھمادوں۔

یہاں بیت المنیرہ میں مَیں حمیدہ پاپیا کے گھر کے سامنے پریشان کھڑی اُس سائیکل رکشے والے کو دیکھ رہی ہوں جو مجھ سے اُلجھ رہا ہے اور غصّے سے کہہ رہا ہے کہ وہ ڈیڑھ روپے سے ایک پائی بھی کم نہیں لے گا۔ ہم جانتے ہیں وہ کہتا ہے۔

''تم پچھمی پاکستانی ہماری ساری پٹ سن سمیٹ کر لے جاتے ہو۔ ہماری چینگڑی ماچھ کا غذائیت سے بھرا سر تک نہیں چھوڑتے ہو، تم لوگ ظالم ہو''۔

میرے حلق میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ ہے۔ ڈکھ سے میں نے سوچا ہے یہ سادہ لوح جاہل انسان جس کی دولت چینگڑی مچھلی ہے۔ کل اِس کا سر کھانے والے کا سر نہیں چھوڑے گا تو اور کیا کرے گا؟

کوریڈور کے آخری کونے میں کھڑی زار زار روتی ہوں۔ شدت گریہ سے میری آنکھیں جلنے لگی ہیں۔ عبدالمالک زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا ہے۔ عبدالمالک جو میرا رشتہ دار نہیں، میرا عزیز نہیں، جس سے میں ابھی تک ملی بھی نہیں۔ پر وہ میری متاع تھی۔ میری قوم کی گراں قدر متاع کہ وہ دشمنِ دین و وطن عناصر کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بنا ہوا تھا۔ اِس دیوار کو ٹی۔ ایس۔ سی سینٹر میں عوامی لیگی غنڈوں نے توڑ ڈالا تھا۔

حُبُ الوطنی کے چند دیوں میں سے ایک اور بُجھ گیا ہے۔ اندھیرے بڑھ رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کس کس کو نگلیں گے۔

۱۹۴۷ء میں وہ روتی تھی، تب اس کے منگیتر نے اُس سے کہا ''سونتیا تم ایک دن یہ ضرور سنو گی کہ ٹکڑے کرنے والوں کے ٹکڑے کردیئے گئے ہیں۔ شکست سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور ہم نے سیکھنے کا عزم کرلیا ہے۔''

اور آج میں روتی ہوں۔ ڈھاکہ چھن گیا ہے زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا ہے۔ یہاں کوئی نہیں جو مجھے یہ کہے کہ روتی کاہے کو ہو۔ عزم ہونا چاہیے۔ ٹوٹے ہوؤں کو جوڑا بھی جا سکتا ہے۔ میرا باپ اور میرا اکلوتا بھائی اپنے کاروبار میں بے طرح منہمک ہیں اور منگیتر پرموشن promotion کے امتحانوں کی تیاری میں۔

وہ اپنے آراستہ پیراستہ گھر میں کسی مہارانی کی طرح رہتی تھی۔ وہ جو ماچھ بھات کھاتی تھی۔ ابوالاعلیٰؒ کی کتابوں کو اٹک اٹک کر پڑھتی تھی۔ نواکھالی کی ٹھیٹھ بنگلہ بولتی تھی۔ وہ جو روٹی کھانے اور لسی پینے اور پنجابی بولنے والوں سے بہت پیار کرتی تھی وہ جسے لاہور آنے کی بہت تمنا تھی۔

میری آنکھیں ڈب ڈب کر اُٹھی ہیں کہ میں نے اُسے لاہور کے ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر ہاتھ سے پنکھا جھلتے دیکھا ہے۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے خشک ہیں۔ ایک نظر اُس نے کھڑکی سے باہر اُگے سبزے پر ڈالی ہے اور کہا ہے۔

''لاہور تو میں آنا چاہتی تھی پر ایسے نہیں جیسے آئی ہوں۔''

وہ پھر خاموش ہے دیر بعد اُس نے کہا ہے۔ ''تم میرے جذبات کو شاید سمجھ ہی نہ سکو۔ زمین کا وہ ایک خاص قطعہ جس میں وہ صدیوں سے رہتا چلا آیا ہو جس سے اُس کے ذہنی وجذباتی رشتے وابستہ ہوں اور وہ اُسے اپنی اور بالکل اپنی سمجھتا ہو۔ پر ایک دن ایکا ایکی اُس کے سارے رشتے اُس سے ٹوٹ جاتے ہیں اور اپنی جان بچانے کے لئے اُسے اَن دیکھی جگہوں کی طرف بھاگنا پڑتا ہے۔''

اور میں نے رندھے گلے اور برستی آنکھوں سے سوچا ہے اگر میرے ساتھ ایسا ہو۔ میرے دل کی گہرائیوں سے صرف یہ دعا نکلی ہے۔

''یہ ٹکڑا میرے معبود ابد تک قائم رہے۔''

16-12-2011 پاکستان

لمحہ فکریہ

محبتیں جو فنا ہو گئیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

تو میں لوٹ کر جاتی ہوں اُن دِنوں میں جب بنگلہ دیش میرا پوربو پاکستان تھا اور میں جولائی 1969ء کی ایک صبح اپنا اٹیچی کیس ہاتھوں میں پکڑے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر اُتری تھی۔ میرے ہاتھوں میں پاسپورٹ نہیں تھا۔ میں ویزا کیلئے اسلام آباد بھی نہیں گئی تھی۔ میں تو اپنے ہی دیس جا رہی تھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی نے مجھے پڑھنے کیلئے بُلایا تھا۔

کتنے ڈھیروں ڈھیر آنسو میرے رخساروں پر بہہ نکلے ہیں جب میں یہ کالم لکھنے بیٹھی ہوں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے سب سے بڑے ویمن ہوسٹل Women Hostel رقیہ ہال میں داخل ہو کر میں نے سوچا تھا۔ یہ کیا کِیا ہم نے۔ میں نے بنگلہ کیوں نہیں پڑھی؟ پچھمی پاکستان کے ارباب اختیار نے اِسے سکولوں میں کیوں نہیں لگایا؟ اگر پوربو پاکستان کے سکولوں میں اُردو پڑھنا ضروری ہے تو پچھمی پاکستان میں بنگلہ کیوں نہیں۔

میں گونگی تھی۔ رابطے کیلئے انگریزی ایک تیسری زبان استعمال کر رہی تھی اور پھر میں نے عہد کیا کہ میں بنگلہ بولوں گی۔ مجھے اپنے وہ سب کلاس فیلو یاد آ رہے ہیں جو میرے ساڑھی پہننے اور بنگلہ بولنے پر بچوں کی طرح خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے تھے۔

آج بھی اسلامی چھاترو شنگھو کے طلبہ کی باتیں کہ ایک ڈھیلی ڈھالی کنفڈریشن دونوں حصّوں میں ہو جائے تو بہتر ہوگی۔ میں روکھی آواز میں کہتی تھی۔ نہیں ایسا مت کہو یہ تو میرے وطن کا مشرقی بازو ہے۔ بازو ٹوٹ جائے تو جسم کتنا بدصورت لگتا ہے۔ اب کہتی ہوں، کاش ایسا ہی ہو جاتا۔ رسوائیاں تو مقدر نہ بنتیں۔ چلو کچھ بھرم رہ جاتا پر بھرم رکھتا کون؟ ہم جیسے بیچارے لوگ جن کا بس صرف اُن کے آنسوؤں پر تھا۔

برٹش لائبریری میں ایف ایس سی میں پڑھنے والا دیناج پور کا نورالامین ایک پروفیسر ماں کا بیٹا جو مجھ سے اکثر باتیں کرتا تھا۔ اپنے دادا سے سُنے ہوئے قصّے کہ جب پاکستان بن رہا تھا۔ پاکستان آرمی کو جوائن کرنا جس کی زندگی کی بڑی خواہش تھی۔ پاکستان سے اُسے کتنی محبت تھی۔ وہ اس کی بقا کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اُٹھانا چاہتا تھا۔ نورالامین مجھے سولہ دسمبر کی اِس ٹھنڈی رات میں کتنا یاد آ رہا ہے۔

ریس کورس روڑ پر ڈھاکہ کلب میں ڈھاکہ کی ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والا اجتباءالرحمٰن میری طرف دیکھتے ہوئے لاہور کی تعریف کرتا ہے۔ واہگہ بارڈر پر شہدا کی یادگار کے بارے اور اس پر لکھے ہوئے پیغام کے بارے میں بتاتا ہے اور آخر میں کہتا ہے 1965ء کی لڑائی آپ کی لڑائی تھی ہماری نہیں۔

میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

یہ بیس فروری 1970ء کی سہ پہر ہے۔ باہر آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، بنگلہ اور اُردو پر جھگڑا ہو گیا ہے، مسلمان کا گلا مسلمان کاٹ رہا ہے۔ کرفیو لگا ہے۔ ایسے میں مجھے دربان پیغام دیتا ہے کہ آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔ میں نے حیرت سے سوچا ہے کہ اس قیامت کے سمے کون ہو سکتا ہے۔ ریسیپشن رُوم میں تیرہ چودہ سالہ لڑکا مجھے نظر آتا ہے جو کہتا ہے "میری ماں آپ کے ساتھ پڑھتی ہیں، مسز نیلما ابراہیم، انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ میں آپ کو یہ دے آؤں۔ معلوم نہیں حال میں آپ کو کھانے کو کچھ ملا ہے یا نہیں؟"

میں لفافے کو بغور دیکھتی ہوں، میرے سینے میں جذبات کا طوفان اُمنڈا ہے۔ باہر اور اندر کا یہ تفاوت میرے حساس ذہن کے ٹکڑے کر گیا ہے۔ میں نے

اُمنڈتے آنسوؤں کو پی لیا ہے، پر میرا جی چاہا کہ میں اس خاکی لفافے کو سارے ڈھاکے میں گھما دوں۔

یہاں بیت المنیر اہ میں مَیں اپنی دوست پاپیا کے گھر کے سامنے کھڑی اُس سائیکل رکشے والے کو دیکھ رہی ہوں جو مجھ سے اُلجھ رہا ہے اور غصّے سے کہہ رہا ہے کہ وہ ڈیڑھ روپے سے ایک پائی بھی کم نہیں لے گا۔ ''ہم جانتے ہیں'' وہ کہتا ہے۔

''تم پچھمی پاکستانی ہماری ساری پٹ سن سمیٹ کر لے جاتے ہو۔ ہماری چینگوی ماچھ کا غذائیت سے بھرا سر تک نہیں چھوڑتے تم لوگ ظالم ہو۔''

میرے حلق میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ ہے۔

کسی بڑے دانشور نے کہا ہے۔شکست سے سبق سیکھنا پڑتا ہے۔

میں ارباب اختیار سے پوچھتی ہوں کیا ہم نے کوئی سبق سیکھا؟

کہاں سیکھا؟ وہ جنہیں غلام سمجھا وہ ترقی کی شاہراہ پر چل پڑے ہیں اور ہم بدتر سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آج بلوچستان کو دیکھیں۔کوئی ان کے پاس جاتا ہے۔کوئی مکالمہ کی بات ہے کوئی پوچھتا ہے تمہیں ہم سے کیا شکایات ہیں؟

جی چاہتا ہے تاڑ ناریل اور سپاری کے جھنڈوں میں گھری باشاہیں دیکھوں جنہیں دیکھے مدتیں گزر گئی ہیں۔تا حدِ نظر پھیلے دھان کے کھیتوں کے سبزے سے آنکھیں ٹھنڈی کروں۔موتی جھیل کی بلندو بالا عمارتوں، سیکنڈ کیپٹل کی ارغوانی عمارتوں کے سلسلوں پر نظر ڈالوں، اولڈ ڈھاکہ کی پُر پیچ گلیوں میں کھو جاؤں۔بُلبل اکیڈمی میں جاؤں۔ نذرل السلام اور ٹیگور کے گیت سُنوں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کی راہداریوں میں بھاگتی پھروں۔

بیت المکرّم کی عظیم الشان مسجد میں جاؤں اور دُعا کروں۔

پر میں کیسے جا سکتی ہوں؟ درمیان میں ویزہ کے چکر ہیں کہ جو اپنا تھا وہ اب غیر بن گیا ہے۔

پاکستان 21-12-2011

لمحہ فکریہ

اندھیروں سے روشنی پھوٹے گی۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

اسلام آباد سرینا ہوٹل میں مصر کے قومی دن کی تقریب کا اہتمام تھا۔یہ غالباً اکتوبر کے آخری ہفتہ کی بات ہے۔پاکستان میں متعین مصری سفیر عزت مآب جناب عامر مگدی جو اپنے مُلک کے ایک بے حد فعال سفیر کے طور جانے جاتے ہیں اس وقت ابھی اپنی سفارتی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوئے تھے۔استقبالیہ پر معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔لاہور سے بُشریٰ رحمٰن اور میں دونوں اس تقریب میں شرکت کیلئے گئے تھے۔سرینا ہوٹل کے وسیع وعریض خوبصورت ہال میں بہت سے مُلکوں کے سفیر اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے۔سفارت خانے کی تقریب میں پاکستان کی ممتاز شخصیات بھی موجود تھیں۔

یہیں سری لنکا کے سفیر کی بیگم سے ملاقات ہوئی مجھے اب ان کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔بات پاکستان کے ابتر حالات سے شروع ہوئی۔دہشت گردی کا بھی ظاہر ہے حالات کی خرابی میں بڑا نمایاں کردار ہے۔وہ بڑے متحمل انداز میں بولیں۔ان کے لہجے میں حالات کے متعلق مثبت انداز میں بات کرنے کا جو انداز تھا وہ میرے حسابوں بڑا تقویت دہ تھا۔

سری لنکا بھی تو ایسی ہی کٹھن گھیریوں میں سے گزرتا رہا ہے۔1954ء میں سنہالیوں اور تاملوں کے جو جھگڑے شروع ہوئے ایک دوسرے کے حقوق کی حق تلفی محرومیوں،ناانصافیوں اور ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر غالب آنے کے الزامات۔ پھر تامل ٹائیگرز کی سرگرمیوں اور دہشت گردیوں کے آغاز نے مُلک میں خانہ جنگی جیسے منفی حالات پیدا کر دیئے۔جب وہ بات کرتی تھیں اپنے سفر سری لنکا کے دوران چند واقعات میرے ذہن کے فلیش بیک سے جھانکنے لگے تھے۔

ہم لوگ کینڈی سے نوریا علیہ جا رہے تھے۔جب راستے میں چند عمر رسیدہ عورتوں کو پیدل چلتے دیکھا دھوپ میں تیزی تھی۔میں نے اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی روک کر ان عورتوں کو بٹھا لے۔گاڑی میں مَیں اور میری دوست ہی تھیں۔ ہمارا ڈرائیور بدھسٹ تھا۔اُس نے فی الفور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"توبہ کیجئے۔یہ تامل ہندو عورتیں ہیں۔بڑی شر پسند قوم ہے کیا پتہ بیٹھتے ہی گاڑی میں دھماکہ کر دیں۔ایسی نیکی مجھے نہیں کرنی۔"

انورادھاپور میں وہ تامل نوجوان لڑکا جس سے میری بہت سے موضوعات پر باتیں ہوئیں۔لڑکے نے جوشیلے لہجے میں کہا تھا۔

احتجاج اور ہتھیار جب اُٹھائے جاتے ہیں تو ان کے پسِ منظر میں معاشروں کے اندر پلنے والی محرومیوں،ناانصافیوں کے عناصر ہوتے ہیں۔سنہالیوں نے ہمیں انسان نہیں سمجھا۔تامل لوگ کتنے غریب ہیں۔کتنے دُھتکارے ہوئے ہیں۔سری لنکا کی کسی ایک حکومت کا نام لیجئے جس نے انہیں اُن کے حقوق دیئے ہوں۔اقتدار کو تو اُنہوں نے اپنی جاگیر بنا لیا ہے۔

میں نے لمبا سانس بھرا تھا۔میرا مُلک بھی ایسے ہی اعتراضات کی زد میں ہے۔

سری لنکا کے ساحلی شہر جافنا میں مسلمانوں کی آبادی ففٹی پرسنٹ ہے۔ کاروباری لحاظ سے یہ بڑے مضبوط اور امن پسند لوگ ہیں۔

تامل ٹائیگرز کے دہشت گردوں نے 1990ء میں صرف دو گھنٹوں کے نوٹس پر اُنہیں اُن کے گھروں سے بے گھر کر کے پورے مُلک میں لاء اینڈ آرڈر Law and order کی بدترین صورت پیدا کر دی تھی۔بہت سے بے گھر لوگوں سے ملاقات ہوئی اور ان کے دُکھ سُنے۔

بڑے عذابوں کے بعد اُن کے مُلک میں سکون ہوا تھا۔وہ خوش تھیں اور پاکستان کیلئے محبت بھرے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی تھیں۔

''گھبرایئے نہیں۔قومیں ابتلا کے دور سے گزرتی ہیں۔تب گھٹا ٹوپ اندھیرے ہی ہر سمت نظر آتے ہیں۔پھر انہی اندھیروں میں سے اُمید کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور ہر سمت روشنی ہو جاتی ہے۔''

پاکستان کیلئے ہماری ڈھیر ساری دُعائیں ہیں۔بشریٰ رحمن میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھیں۔میرے آنکھیں گیلی سی تھیں۔بشریٰ رحمن کا تعارف کرواتے ہوئے میں نے ان کے جذبات سے بشریٰ کو آگاہ کیا۔

نا اُمید ہونے کی بجائے ہمیں اس اُمید کا دامن تھامنا ہے کہ ہر شب اپنی سحر کا پیغام لیے ہوئے ہے۔

بڑی خوبصورت بات تھی جس نے ہمیں تقویت دی۔آج جب ہر طرف مایوسی اور نا اُمیدی دیکھتی ہوں تو مجھے اُن کی باتیں یاد آتی ہیں۔

خدا کرے ہماری بھی شب کی اب سحر ہو جائے۔ (آمین)

پاکستان 03-02-2012

لمحہ فکریہ

ہمارے رویّے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

قوموں کی ذہنی تربیت کتنی ضروری ہے اس کا احساس تو ہمیشہ ہی ہوتا رہا ہے۔ پاکستانی قوم کیلئے تو یہ تربیت کھانے کی طرح ضروری ہے۔ اِن دنوں اس کمی کو میں نے بہت بُری طرح محسوس کیا ہے۔ ہم ہمہ وقت حکومتوں کو تو لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ فلاں سہولت ملنی چاہیے نہیں ملی تو تبرّوں اور کوسنوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ فلاں کام ہونا چاہیے نہیں ہوا۔ ساتھ ہی لعن طعن مگر خود ہمارے اپنے کردار کیا ہیں؟ اور ہمارے شہری ہونے کے ناطے کیا فرائض ہیں؟ کیا ہم نے کبھی اس پر غور کیا؟ کبھی نہیں۔ لاہور ایک بے سُرے انداز میں بڑھتی آبادی والا شہر ہے۔ آبادی دن بدن تجاوز کرتی جا رہی ہے۔

چھوٹے شہروں میں انڈسٹری نہ ہونے کی وجہ سے بڑے شہروں پر ہمیشہ دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ یہی لاہور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ آبادی کا بڑھتا دباؤ ڈھیروں ڈھیر مسائل جنم دیتا ہے جن میں سب سے بڑا مسئلہ انفراسٹرکچر کا ہے۔ کسی بھی شہر کسی بھی مُلک کی ترقی کا پہلا ثبوت وہاں کی سڑکیں اور ذرائع آمدورفت کی سہولتوں کا موجود ہونا ہے۔

لاہور جیسا شہر بھی گوناگوں مسائل کا شکار رہتا ہے۔ جو بھی ہے ماننا پڑے گا کہ ضلعی انتظامیہ بے حد مستعد ہے۔ بے شمار منصوبوں پر سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔ سڑکوں کی تعمیر، ان کی مرمت، اوور ہیڈ برج ہر اُس جگہ بنانے کی کوشش میں ہے یا بنا چکی ہے جہاں ٹریفک کا اژدہام رہتا ہے مگر عوامی رویّے کیا ہیں؟

ہر شخص افراتفری اور تیزی میں ہے۔ ٹریفک سگنلز پر رُکنا محال ہے۔ اشارہ ابھی پوری طرح کُھلتا بھی نہیں کہ موٹر سواریوں زن سے موٹر سائیکل نکال کر لے جاتے ہیں کہ جیسے وہ ایف 16 میں بیٹھے ہیں اور طیارہ لامحدود فضاؤں میں محوِ پرواز ہے۔ چوکوں پر ٹریفک کے بے پناہ رش کو کنٹرول کرنے کیلئے اور اطراف کی آبادیوں کو شاہراؤں پر چلتی ٹریفک معطل نہ کرنے کیلئے مصروف شاہراہوں پر لوہے کے اوور ہیڈ برج جگہ جگہ بنائے گئے ہیں۔

بعض جگہوں پر یہ برج پینٹ پالش سے چمکتے اور پھولوں کی ٹوکریوں سے سجے سچی بات ہے سڑک کی شان بڑھاتے ہیں۔ پر اِن کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اِسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ شاذونادر ہی کبھی اُن آرام دہ سیڑھیوں پر کوئی بندہ آپ کو چڑھتا نظر آئے گا۔ ملتان روڈ پر تو قابلِ رحم حالت ہے۔ یہاں بہت شاندار سڑک بنائی جا رہی ہے۔ بہت ساری جگہوں پر کٹ بھی دے دیئے گئے ہیں اور اوور ہیڈ برج بھی بن گئے ہیں مگر لوگوں نے درمیانی نالے پر جگہ جگہ چوبی پھٹے رکھ دیئے ہیں۔ عورتیں بچے اور نوجوان بھاگ کر پہلے اُن تک پہنچتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے دو ڈھائی فٹ اونچے اس نالے پر چڑھتے ہیں۔ چھلانگ مار کر سڑک پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نوجوان عورتیں، لڑکے، بچے کناروں پر تیز رفتار گاڑیوں کے آگے سے گزرنے کی کوشش میں موت کو دعوت دیتے ہیں۔ خدانخواستہ کسی بھی ایکسیڈنٹ کی صورت میں گاڑی والوں کے لتّے لئے جاتے ہیں۔

یہی حال ہمارا سڑکوں پر کوڑا کرکٹ پھینکنے کا ہے۔ مہذب پڑھے لکھے لوگ چلتی گاڑی سے شیشہ کھول کر کسی پھل کا چھلکا، مونگ پھلی کے دانے، کوئی لفافہ شاپر یوں آرام سے پھینک دیں گے کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ کوئی پوچھے کہ آپ پل بھر کیلئے یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اِسے اپنے پاس رکھ لیں۔ کہیں کوئی مناسب جگہ ملے تو وہاں اِسے ٹھکانے لگا دیں۔ پارکوں میں جگہ جگہ رکھے ڈسٹ بن بیچارے شور مچاتے رہتے ہیں کہ ہمیں استعمال کریں مگر مجال ہے ہمارے کانوں پر جوں رینگ جائے۔

ہم تو اِسے بھی توہین سمجھتے ہیں کہ کھا پی کر چھلکے سمیٹ لیں۔ جگہ صاف کر دیں۔ ہم مسلمان ہیں پہلا سبق ذاتی اور اپنے ماحول کی صفائی کا پڑھتے ہیں۔ اور

صفائی نصف ایمان ہے ہمارے عقیدے کا ایک اہم جزو ہے مگر ہم لوگوں نے اِس جزو کو کیسے اپنی زندگیوں سے خارج کر دیا ہے۔

پاکستان 20-02-2012

لمحہ فکریہ

طالبان سے امریکہ کی صلح جوئی کی کوششیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

قطر میں طالبان کے ساتھ امریکہ کے مذاکرات کرنے کے عمل میں جس طرح اور جس انداز میں کرزئی حکومت کو پرے پرے رکھا گیا ہے اُس نے مجھے سی آئی اے کے اُس عراقی غدار الجبوری تکریتی کی یاد دلائی ہے جس کا رشتہ دار مجھے بغداد شہر کی مضافاتی آبادی صدر سٹی کے ایک گھر میں ملا تھا جو شیعہ تھا اور اُس شیعہ تنظیم البدر سے منسلک تھا جو امریکیوں کو کسی صورت برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ شیعہ سُنی اتحاد کا زبردست علمبردار۔ اُس کی دِلی ہمدردیاں اُن تمام جماعتوں سے تھیں جو عراق میں امریکہ کی موجودگی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھیں۔

میرا ٹیکسی ڈرائیور میرے سقوط بغداد سے متعلق چند سوالوں کے جواب میں مجھے صدام کی خفیہ انٹیلی جنس کے ایک کرنل کے پاس لے گیا تھا بصیر الحانی جس کے ہاں البدر گروپ سے وابستہ یہ شخص مہمان آیا ہوا تھا فارس مہدی۔

اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ پہلے جماعت الفاتحین میں شامل مزاحمت کی تاریخ مرتب کر رہا تھا بعد میں القاعدہ میں شامل ہوگیا۔ خیر سے افغانستان میں بھی کچھ سال رہا۔ پشاور حیات آباد میں تین ماہ کے تربیتی کورس میں شامل ہوا۔ آئی ایس آئی کے چند افسروں کے نام بھی اُس نے لیے۔ میں نے دلچسپی اور حیرت سے اُس شخص کو جو کل کا ہیرو آج کا زیرو اور مانا ہوا دہشت گرد تھا دیکھا تھا جس نے اجنبی جگہ پر بیٹھ کر میرے وطن کی بات کی تھی۔ وہ کسی حوالے سے بھی تھی مجھے اچھا لگا تھا۔ مثبت اور منفی کی بحث کے بغیر۔ یوں شکوک وشبہات کی پرچھائیں سی میرے دماغ سے اُٹھ کر میری آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ شیعہ آبادی کی اکثریت والے علاقے میں القاعدہ کا یہ سرگرم کارکن کیسے؟ اور سوال ہونٹوں پر بھی آ گیا تھا۔

جواب میں سُننے کو جو ملا وہ یوں تھا کہ وہ تو خود شیعہ مسلک سے ہے پر شیعہ سُنی اتحاد کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ اُس کا دشمن صرف امریکہ ہے۔ حُلیے بدلنے میں اُسے کمال حاصل ہے۔ بصیر الحانی کو تو گوروں کی طرح مانتا ہے۔ ممکن نہیں کہ بغداد آئے اور ملے بغیر چلا جائے۔ رات کو کوئی گیارہ بجے آیا تھا۔ میرے لیے یہ بھی ایک خوشگوار اور مسرت آمیز بات تھی کہ وہ انگریزی اچھی بولتے تھے۔ عراقی پڑھی لکھی قوم جس کے ریڑھی والے بھی انگریزی کا دال دلیہ بخوبی کر سکتے ہیں۔

تو جب اُس نے بتایا کہ سقوط بغداد میں مرکزی کردار ادا کرنے والا الجبوری تکریتی جو اُس کا رشتہ دار تھا۔ جو صدام کی خفیہ ایجنسی سے نکالے جانے کے بعد سی آئی اے کے ہتھے چڑھا۔ ڈالروں کے بوروں سے اُس نے اہم لوگوں کو خریدا اور صدام انٹرنیشنل ایرپورٹ پر انتہائی سہولت سے امریکی فوج کا قبضہ کروا کے اُن تمام مجاہدین کو شہید کروایا جو عرب دُنیا کے مختلف ممالک سے اپنے اپنے طور پر اس جہاد میں حصّہ لینے کیلئے بغداد آئے ہوئے تھے۔

پر اس کا انجام کیا ہوا؟ اُس نے اپنے بارے میں لکھا اور یہ لکھا ہوا تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔ امریکہ بہت ناپائیدار اور طوطا چشم دوست ہے۔ اپنے مفاد کیلئے آپ کے ناز نخرے اُٹھائے گا۔ آپ پر واری صدقے ہوگا۔ جب آپ کی ضرورت نہیں رہے گی آپ کو کوڑے میں پھینک دے گا۔ میں اس وقت فدائین کی ٹاپ لسٹ پر ہوں پر مجھے اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں۔

یہ 2008ء کی بات ہے جب اُس نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تھا۔ یہ مُلا عمر جس کے سر کی قیمت لاکھوں ڈالروں میں ہے جسے اسامہ بن لادن کے بعد وہ اُڑانا چاہتے ہیں کل اس کے ساتھ مذاکرات کرے گا۔

2008ء میں کہی گئی اِس بات کی صداقت 2012ء کے آغاز میں ہو رہی ہے۔

انہیں افغانیوں نے نتھ نہ ڈالی تو پھر دیکھیے۔اُن کا کیا بگاڑ رہے ہیں۔خود کو آگ میں جھونک رکھا ہے۔وہ جاہل، اُجڈ، گنوار جنہیں دُنیا ایسے ہی بے شمار خطابات سے نوازتی ہے کیا جی دار قوم ہے۔ٹوٹی چپلوں کے ساتھ چھلانگیں مار کر جہازوں میں بیٹھتی اور انہیں اُڑاتی ہے۔امریکہ کو اُلو بنانے کا فن جانتی ہے۔کیا فوج، کیا پولیس، کیا ایجنٹ۔ جدید ہتھیاروں کی سپلائی طالبان کی سرکوبی کیلئے امریکہ سے حاصل کرتی ہے۔طالبان سے سودے بازی ہوتی ہے۔با قاعدہ منصوبہ بندی سے نورا کشتی کا اہتمام کرتے ہوئے امریکیوں کو پیغام دیتی ہے کہ طالبان اسلحہ لُوٹ کرلے گئے ہیں۔مزید دو۔

اب کیسی صورت حال سامنے آرہی ہے۔کرزئی حکومت کو غصہ ہے کہ امریکہ کو طالبان سے مذاکرات کرنے کی اتنی مصیبت کیا پڑی ہوئی ہے۔دوحہ میں طالبان کو اپنا دفتر کھولنے کی اجازت دینے کیلئے بیتاب ہے۔

اب کیا کرزئی طالبان سے صُلح صفائی نہیں چاہ رہا ہے۔کئی بار تو درخواست کر چکا ہے کہ وہ مذاکرات چاہتا ہے لیکن اس درخواست کو پذیرائی نہیں مل رہی ہے۔تاہم امریکہ کُھل کر سامنے آگیا ہے۔اپنی اُس ذہنیت کے ساتھ کہ اُس نے وقت پڑنے پر کیسے گدھے کو اپنا باپ بنانا ہے۔

چلو تھوڑی سی عقل مُلّا عمر کو بھی آگئی ہے کہ وہ جس ضد اور ہٹ دھرمی پر کھڑا تھا اس سے تھوڑا ہٹ گیا ہے۔تعاقب میں سعودی عرب کا پریشر ہے یا اپنی بصیرت کہ اب واشگاف لفظوں میں یہ کہنا کہ ہم اپنی زمین کسی دوسرے مُلک کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

امریکہ کی بے تابیاں دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔کرزئی حکومت کو اپنا یوں نظر انداز کیے جانا ناگوار گزرا ہے۔ابھی پاکستان میں ایرانی صدر کی آمد پر کرزئی کا آنا اور پاکستانی اور ایرانی صدر کے ساتھ بیٹھنا دراصل امریکہ کو یہ پیغام دینا ہے کہ اُسے نظر انداز کرنا امریکہ کیلئے اتنا آسان نہ ہوگا۔اُس کے پاس کھیلنے کیلئے پتے ہیں۔

اب دیکھیے آنے والے دنوں میں حالات کیا رنگ اختیار کرتے ہیں۔

پاکستان 25-02-2012

لمحہ فکریہ

ولادی میر پیوٹن ڈنکے کی چوٹ پر کہو

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

ابھی چند دنوں پہلے آئی این پی کے حوالے سے ایک خبر چھپی۔روس کے ولادی میر پیوٹن نے انتخابات جیت کر جو پہلا اعلان کیا وہ روس کے عالمی سطح پر نمایاں کردار ادا کرنے کے حوالے سے تھا۔اُن کا کہنا تھا کہ اب کسی کو اکیلے دُنیا کے فیصلے نہیں کرنے دیں گے۔

اِس بات کی گونج یقیناً سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں بھی سُنی گئی ہوگی۔

مجھے یاد آیا تھا۔پیٹرزبرگ کے پیٹرہاف میں میری ملاقات پیٹرزبرگ یونیورسٹی کے چند طلبہ سے ہوئی تھی جنہوں نے میرے پاکستانی ہونے کا جان کر فی الفور کہا تھا۔

''اچھا امریکہ کا پٹھو۔امریکہ، رُوس اور افغانستان وار کا تیسرا اہم کردار۔''

پل بھر کے لئے تو منہ میں جیسے گنگنیاں سی ڈل گئیں۔لڑکے نے تو جیسے کچا چٹھا منہ پر دے مارا۔پھر ہوش آیا۔اور زبان گڑگڑاہٹ کے ساتھ پٹڑی پر چڑھ گئی۔

''لو جی یہ تو وہی بات ہوئی۔چوری اور الٹے چتر۔ایک چڑھائیاں کیں۔پنگے لئے۔خود ذلیل ہوئے اوروں کو ذلیل کروایا۔قدرت نے دوسری سپر پاور کا تمغہ سر پر سجا رکھا تھا۔اُسے بھی سنبھالنا نہیں آیا۔منہ کے بل دھڑام سے گرے۔غریب مُلکوں کی آس تھے۔اُمید تھے۔اُن کی آس اُمید توڑیں۔رُسوا کردیا کم بختوں کی گرم پانیوں پر تصرف کی خواہشوں نے۔کبھی جاپان سے پنگے لیتے تھے۔کوریا تک پہنچنے کے آرزومند تھے۔پولینڈ کا تیاء پانچا کردیا۔افغانستان کے ساتھ پاکستان کو بھی نشانے پر رکھلیا۔منہ کی کھاتے ہیں پر بندے نہیں بنتے۔

افسوس طاقت کا سارا توازن خراب کردیا اور بدمعاش کو دُنیا میں کُھل کھیلنے کا موقع دے دیا۔

لڑکے تو سچی بات ہے میں نے بولنے جوگے نہیں چھوڑے تھے۔اب وہ ذرا پرے بینچ پر بیٹھ گئے۔میرے پوچھنے پر کہ وہ کیا کرتے ہیں۔وہی تیز سالڑ کا بولا تھا۔

''پیٹرزبرگ یونیورسٹی میں سیاست پڑھتے ہیں۔''

''ارے سیاست پڑھتے ہو اور بونگیاں مارتے ہو۔اور جانتے ہی نہیں ہو کہ تمہاری احمق سیاسی قیادت اور ٹاپ دفاعی وزارت نے مروا دیا۔مُلک کی ہیبت بگاڑ کر رکھ دی۔اب اگر 24 دسمبر 1979ء کی اُس سرد ترین شام کو روسی وزیر دفاع استینوف اپنے نائب پاولوسکی کی بات دھیان سے سُن لیتا۔چند لمحوں کے لئے اس اَمر پر غور کرلیتا کہ وہ آخر افغانستان سے آرہا تھا اور اِس بات پر مُصر تھا کہ افغانستان میں فوج بھیجنا مناسب نہیں۔اور جب وہ بار بار کہتا تھا کہ پولٹ بیورو کے کسی ممبر کی ڈیوٹی لگائی جائے کہ وہ حفیظ اللہ امین سے ملے۔حفیظ اللہ نے برژنیف کے لئے خصوصی پیغام بھیجا ہے۔تو حرج ہی کیا تھا کہ اس پر غور و غوض ہو جاتا۔

پر تاریخ کا جبر یہی ہے کہ جب تباہیاں سر پر کوکتی ہیں تو پھر فیصلے غلط ہوتے ہیں اور عقلیں ماری جاتی ہیں۔پاولوسکی کی تو کسی بات کو سُنا ہی نہیں گیا۔''

اور لڑکے میرا منہ دیکھتے تھے۔یقیناً انہیں اس پاکستانی عورت سے ایسے جارحانہ جوابوں کی توقع نہیں تھی۔

اور اب روسی حکومت دھڑا دھڑ بڑی تعداد میں اسلحہ خرید رہی ہے۔29 نئی آبدوزیں،50 بحری جہاز،100 مصنوعی سیارے، 400 نئے بین البراعظمی بلیسٹک میزائل، 600 ہیلی کاپٹر،600 نئے فائٹرز اور 2300 ٹینک خریدے جارہے ہیں۔

خطے میں ہندوستان کی غیر معمولی فوجی سرگرمیاں اور اسلحہ کی خریداری کیلئے روس سے بھی بڑھ کر جوش وخروش کا اظہار۔بڑے تھانیدار کی ایران کو دھمکیاں۔
اب کہاں طبل جنگ بجتا ہے اور ولادی میر پیوٹن کا یہ بیان کس حد تک عالمی سیاست پر اثر انداز ہوتا ہے۔
''دیکھیے آسمان کے نئے رنگوں کو''۔

پاکستان 14-03-2012

لمحہ فکریہ

حسینہ واجد ابھی بھی اتنی ہی جذباتی ہیں۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان کرکٹ کے فائنل میچ کے دن وی آئی پی انکلوژر Enclosure میں بیٹھی حسینہ واجد کے چہرے پر چھائے رنج والم کے بادلوں کی گھمبیرتا اور پھر تقسیم انعامات سے قبل ہی اُن کا اُٹھ کر چلے جانے کو کیا کہا جائے۔ یہ اُن کی بھارت کو خوش کرنے کی امیچوری کوشش تھی۔ پاکستان کو بتانے اور جتانے کا ایک انداز تھا کہ میرا دل ابھی بھی بغض اور نفرت سے بھرا ہوا ہے اور ہم ابھی بھی تم لوگوں اور تمہاری کامیابیوں سے نفرت کرتے ہیں یا پھر دُنیا بھر کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ میں ابھی تک ذہنی طور پر اُس بلوغت میں داخل نہیں ہوئی ہوں جو سربراہان مملکت کیلئے ضروری ہوتا ہے اور جس کا عملی مظاہرہ انہیں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سکرین پر میں نے اُن کا آج کا چہرہ دیکھا تھا جس پر 43 سالوں نے بہت سے نشان چھوڑے ہوئے ہیں۔ میری یادوں میں نومبر 1969ء کی وہ رات اُبھری تھی جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی طالبہ کی حیثیت سے یونیورسٹی کے رقیہ ہال میں مقیم تھی اور آڈیٹوریم میں کھڑی اپنے بنگالی دوستوں سے سُنتی تھی کہ کھانے کیلئے ڈائننگ روم میں جلدی چلو۔

حسینہ واجد نے آج ہال آنا ہے اُن کی تقریر ہے۔

گو مارشل لاء کا زمانہ تھا پر گورنر احسن نرم دل چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے اور لوگ باگ ان کی اس کمزوری سے آگاہ تھے۔

ٹھیک نو بجے وہ ہال میں آئیں۔ عوامی لیگی لڑکیوں کے ایک جم غفیر نے ان کا استقبال کیا۔ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے پرو انڈیا اور چائنا گروپوں کی لڑکیاں دُور کھڑی تماشا دیکھتی تھیں۔

آج جیسا ہی چہرہ تھا۔ بس ذرا ملاحت اور نمکینی زیادہ تھی۔ جوانی کا بانکپن بھرپور تھا اور آواز میں گھن گرج بھی تھی۔ تقریر بنگلہ میں تھی۔ میں تھوڑی بہت بنگالی سیکھ چکی تھی اور تھوڑا بہت دال دلیہ کر بھی لیتی تھی پر اِس درجہ روانی سے کی جانے والی تقریر تو سمجھ سے بالا تر تھی۔ ساتھی لڑکیوں نے تھوڑا بہت واضح ضرور کیا پر جہاں زیادہ تعصب جھلکیاں مار رہا ہوتا وہ حصّہ گول کر جاتیں۔ آخر میرا اُن کا ہمہ وقت کا ساتھ تھا اور گو میں ویسٹ پاکستانی تھی پر بہر حال دوستی تو تھی۔

یہ میری جوانی کے دن تھے اور مجھے جنون کی حد تک پامسٹری سے شغف تھا۔ مہارت کا تو کوئی دعویٰ نہیں تھا پر اتنا یقین ضرور ہو چکا تھا کہ اچھا دیکھ لیتی ہوں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابوسعید چوہدری جو بعد میں بنگلہ دیش کے صدر بنے اُن کا ہاتھ بھی دیکھ چکی تھی۔

''ارے ان کا ہاتھ دیکھا جائے'' میں نے سوچا اور اس سوچ کے آتے ہی میں ان کے قریب چلی گئی۔ جونہی تقریر ختم ہوئی میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا اور درخواست کی کہ میں اُن کا ہاتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے دیکھا وہ کھل اُٹھیں۔ مجھے دھان منڈی آنے کی دعوت دی۔ وقت رخصت انہوں نے لڑکیوں کے ہجوم میں مجھے دیکھا اور میری طرف ہاتھ ہلایا۔ میں نے آگے بڑھ کر وقت اور دن پوچھا۔ یہ غالباً منگل کا دن، وقت چھ بجے اور تاریخ غالباً 16 نومبر 1969ء تھی۔

وقت مقررہ میں ان کے گھر پہنچی۔ میں نے ان کے ہاتھوں کے پرنٹ لیے اور تین دن بعد دوبارہ آنے کا کہا۔

کچھ بتاؤ۔ ان کے لہجے میں بچگانہ اصرار تھا۔ میں پاکستان کے مشہور دست شناس جناب ایم اے ملک کی باضابطہ شاگرد تو نہیں تھی پر بہت سے سبق اُن سے پڑھتی تھی۔ ہنستے ہوئے میں نے کہا صبر۔ درمیان میں دن تو صرف تین ہی ہیں۔

سچی بات ہے یہ ہاتھ ایک بے حد جذباتی اور خود پسند عورت کا ہاتھ تھا۔اِس ہاتھ میں عروج کی لکیریں تھیں پر کچھ الیے بھی تھے جنہیں میں نے ڈھکے چُھپے لفظوں میں ضرور کہا کہ عالم الغیب تو اسی کی ذات ہے۔

پر جب علیحدگی ہوئی اور ان کے خاندان پر تباہی آئی۔اس حادثے پر ملال یا دُکھ کی بجائے مجھے اپنے علم کے سچ ثابت ہونے کی خوشی تھی۔

اور سچی بات ہے کہ وہ آج بھی جذباتیت کا شکار نظر آتی ہیں۔

سربراہ مملکت کے طور پر انہوں نے کس کردار کا مظاہرہ کیا۔کھیل کو کھیل کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھا۔اپنے لوگوں اور بیرونی دُنیا کا کیا پیغام دیا۔سپورٹس مین شپ Sportsman Ship جو کھیلوں کا بنیادی عنصر ہے بنگلہ دیش کی ٹیم اُس سے محروم تھی۔بچوں کی طرح رو رہی تھی۔دو دنوں بعد الزامات تراشی شروع ہوگئی اور اب گوہر افشانی ہو رہی ہے کہ خالدہ ضیا چونکہ سٹیڈیم میں آگئی تھیں اس لیے بنگلہ دیش ٹیم ہار گئی۔

ذرا آمریت ملاحظہ ہو کہ وہ سٹیڈیم میں کیا لینے آئی تھیں؟ اُنہیں کس نے آنے کو کہا تھا۔

ہندوستان میں سارک کانفرنس میں شرکت کیلئے گئی تو انڈیا پاکستان کا ورلڈ کپ ہونے والا تھا۔دِلّی کی تقریب میں ان کا ایک سینئر وزیر مدعو تھا جس نے کہا۔مجھے کہا جا رہا ہے۔انڈیا ٹیم کو جیتنا چاہیے۔دُعا کرو۔

بھئی میں کیوں دُعا کروں۔جو اچھا کھیلے گی وہ جیت جائے گی۔کھیل کو کھیل بنائیں عذاب نہیں۔

خیر یہ بھی انفرادی کیس ہے وگرنہ تو انڈیا والے بھی بیہودگیوں پر اُتر آتے ہیں۔

پاکستان 03-04-2012

لمحہ فکریہ

امریکی بربریت کی کہانیاں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

چند دن ہی گزرے ہیں جب اخبارات میں ایک امریکی فوجی کے ہاتھوں 16 افغان شہریوں کے بہیمانہ قتل کی خبر چھپی ۔صوبہ قندھار کے گاؤں الخوئی میں امریکی فوجی نے جس بربریت کا ثبوت دیا، لاشوں کو جلایا اور پھر اطمینان سے واپس اپنی یونٹ میں آیا ۔یہ 38 سالہ سارجنٹ رابرٹ بیلس تھا ۔کہا گیا ہے وہ اکیلا ہے جو صریحاً غلط ہے کہ اُس کے ساتھ اُس کے ساتھی بھی ہوں گے ۔یہ رابرٹ عراق میں رہا ۔اب اُسے بچانے کیلئے جو پلی Plea لی گئی ہے وہ اس کے سر کی انجری ہے جس نے میڈیکلی اس کے ابنارمل ہونے کو ثابت کرنا ہے اور اس امریکی کو بچالینا ہے ۔

یہی کام انہوں نے عراق میں کیے ۔صدام کی خفیہ ایجنسی کے ریٹائرڈ کرنل ابراہیم الحانی اور القاعدہ کے فارس مہدی جن سے میری ملاقات بغداد کے صدر سٹی کے علاقے میں میرے ٹیکسی ڈرائیور کی وساطت سے ہوئی تھی جنہوں نے کئی واقعات سُنائے مگر بغداد کی ٹاپ فیملی مصطفےٰ البرزانی السریۃ ثانیہ کا لینڈ لارڈ کی پوتی عبیر کے ساتھ ان امریکی غنڈوں نے جو کیا وہ بربریت کی ہولناک کہانی ہے ۔

امریکی حملے کے بعد بغداد میں مقیم عبیر البرزانی جو میڈیکل کی سٹوڈنٹ تھی اپنی ماں اور بہن کے ساتھ دادا کے پاس اپنے گاؤں جانے کیلئے روانہ ہوئی ۔

بغداد موصل روڈ پر چڑھنے سے پہلے ڈرائیور نے گاڑی شہر کی اندرونی چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے گزاری تھی ۔بغداد کا مضافات ترقی پذیر شہروں جیسا ہی تھا بے ترتیب اور بکھرا ہوا سا ۔مگر اس بے ترتیبی پر جنگ کا فضلہ جو رنگ جما رہا تھا وہ وحشت ناک تھا ۔

سریۃ الثانیہ تک انہیں چھ پوسٹیں بھگتانی پڑیں جو سب کی سب امریکی سپاہیوں کے قبضے میں تھیں ۔

پہلی چیک پوسٹ پر گاڑی روک لی گئی ۔امریکی فوج کی جی آئی بٹالین کے چھ جوانوں نے گاڑی کو اپنے حصار میں لے لیا ۔سواریوں کو اُترنے اور تلاشی دینے کو کہا گیا ۔

کیسا المیہ ۔ہمارا وطن، اور ہم تلاشی دیں انہیں جو غاصب ہیں ۔جارح ہیں ۔بندوقوں اور گولیوں کے سروں پر تیرتے یہاں آئے ہیں ۔رحم پروردگار رحم ۔عبیر چیں بجبیں تھی ۔

عبیر کے بڑے ماموں نے اسپیشل اجازت نامہ بغداد زون کے چیف ایڈمنسٹریٹو کے ذاتی دستخطوں سے دیا تھا کہ زیادہ پوچھ پڑتال نہ کی جائے مگر پھر بھی یہ سلسلہ جاری تھا ۔

تیسری چیک پوسٹ پر عبیر کا نام لکھتے ہوئے پوچھا گیا ۔اس کے معنی؟

عبیر نے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا ۔

تمہارا اس سے مطلب؟ مگر ماں نے بیٹی کو ڈپٹا اور اُن سے مخاطب ہوئی ۔

یہ عربی زبان کا لفظ ہے زعفران کی خوشبو اور کیسر کا رنگ مل جائے تو اُسے عبیر کہتے ہیں ۔

یہ چھٹی چیک پوسٹ تھی ۔کیموفلاج یونیفارم میں آہنی ٹوپیوں کی پیشانیوں پر جڑی سپاٹ لائٹوں سے سروں کو ڈھانپے چار ایک جیسی قد و قامت والے لڑکے گاڑی کے گرد کھڑے ہو گئے تھے ۔

ڈکی چیک ہوئی ۔ولادہ،عبیر اور رباء کو نکال باہر کھڑا کیا۔عبیر نے سیاہ عبایا پہن رکھی تھی۔ بڈ میں صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔جھیل جیسی آنکھیں جوحزن یاس کے پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ایک نے رعونت سے کہا۔چہرہ دکھاؤ۔نقاب نیچے کرو۔

کیوں کروں۔کیوں کروں۔اُس نے ترشی سے کہا۔

ولادہ نے ہاتھ دبایا۔اور نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی۔لڑکیاں پردہ کرتی ہیں ہماری سوسائٹی میں۔

دراصل ہمیں احکامات کی پیروی کرنا ہوتی ہے۔تلاشی کا حکم ہے۔

اُس نے ایک جھٹکے سے چہرہ ننگا کرتے ہوئے مغلظات کا طوفان اٹھادیا۔چاروں گُم سُم اُسے دیکھتے اور اُس کی گالیاں سُنتے تھے۔ایسا چاند چہرہ کہ جس نے انہیں ٹر ٹر تکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کاروائی ضرور ہوئی مگر نرم انداز میں۔گاڑی کا نمبر نوٹ ہوا۔جہاں سے آئے تھے اور جہاں جانا تھا درج ہوا۔

کاش میرے پاس ہینڈ گرینڈ بم ہوتے تو میں اِن کے چیتھڑے اڑا دیتی۔

اُس نے دوبارہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

ایک شام آخری چیک پوسٹ کے چاروں نوجوان جب نشے میں مخمور ہوئے تو اپنی اپنی محبوباؤں اور اپنے بیوی بچے کی یاد میں آہیں بھرتے ہوئے عراقیوں کو گالیاں نکالنی شروع کیں کہ ان جاہل اجڈ کنجڑوں کو ڈکٹیٹر صدام سے نجات دلانے اور ان کے اسلامی فاشزم کو جمہوریت کا مزہ چکھانے کیلئے انہیں اپنے خوبصورت وطن اور آسائشوں سے بھری زندگی کو چھوڑ کر ان کالے پانیوں میں آنا پڑا۔

بس ایسے ہی لمحوں میں وہ بھوری آنکھوں اور زعفران کی خوشبو والی عبیر انہیں یاد آئی تھی۔فلک شگاف سا نعرہ لگایا۔رجسٹر کھول کر پتہ نکالا۔جیپ میں بیٹھے اور چل پڑے۔

ایک نے یہ شاندار سی حویلی دن کی روشنی میں پٹرولنگ کرتے ہوئے دیکھی تھی۔بلند و بالا چوبی دروازہ بند تھا۔دستک پر ملازم نے چوبی کھڑکی کھول دی۔

پہلا نشانہ اَدھیڑ عمر ملازم تھا۔چیتے جیسے پھرتی سے انہوں نے سب کمروں کو اپنے حصار میں لیا۔

مصطفےٰ البرزانی کو پتہ نہیں لگایا۔بیڈ پر غنودگی میں ہی سُلا دیا۔

عبیر سو رہی تھی۔دفعتاً وہ ہڑ بڑا کر اُٹھی۔کمرہ اُس کی ماں اور بہن کی چیخوں سے بھرا ہوا تھا۔چند لمحوں کیلئے اُسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے یا بغداد کی گلیوں بازاروں میں ناچتا تھرکتا منظر اُس کے گھر آ گیا ہے۔

کمرے میں چار فوجی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔اُس کی ماں گھبرائی ہوئی خوفزدہ اونچے اونچے انگریزی میں کہتی تھی کہ وہ کیوں اُن کے گھر آئے ہیں؟ اُن کا یہاں کیا کام؟

ابھی تو بمشکل اُس کی آنکھوں نے اس منظر کی حقیقت کو قبول کیا ہی تھا کہ اس سے بھی کہیں ظالمانہ،سفاکانہ اگلا منظر سامنے آ گیا۔دو ہاتھوں نے آگے بڑھ کر دونوں کو نشانے پر رکھا اور پَل بھر میں وہاں خون کے فوارے تھے۔چیخیں تھیں۔دھڑام سے گرتے وجود تھے۔وہ تو کِسی کو سنبھالنے آگے بھی نہ بڑھ سکی تھی۔

اب قیامت گُھڑی پر پا ہوئی تھی۔زعفران کی خوشبو اُڑی اور کیسر کا رنگ بے رنگ ہوا۔پر سامرہ کا آسمان ویسے ہی کھڑا تھا۔ٹوٹ کر نہیں گرا۔

وہ جو تین تھے مستی میں تھے اور چوتھا جو اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھو سکا تھا۔اُول فُول بکتا تھا۔اُونچے اُونچے لینڈن اور ولسن کو کُتیا کے پلّے کہتے ڈکراتا تھا۔

جسم کی بھوک مٹی تو پیٹ کی بھوک چمکی۔دو کچن میں گئے۔فریج میں سینتی ہوئی مرغیاں باہر نکلیں اور آگ پر بھُوننے لگیں۔

وہ تینوں کچن میں بیٹھے روسٹ ٹانگیں کھاتے تھے۔صحن میں زعفران کی خوشبو میں بسا اور دودھ میں ٹپکے کیسر کے قطرے میں گھُلے رنگ جیسا وجود مٹی کے تیل اور آگ کے شُعلوں میں جلتا تھا۔چوتھا وزنی بوٹوں کے ساتھ صحن میں چکر کاٹتا اُنہیں گالیاں نکالتا اور موبائل پر سارے منظروں کو محفوظ کرتا پھرتا تھا۔

اُن میں سے ایک نے بوٹی کے بڑے سے ٹکڑے کو دانتوں سے نوچتے کھسوٹتے کہا۔

مجھے جوفیالز پر ترس آرہا ہے۔ بیچارہ پیاسا رہ گیا نا۔ اُس نے سُنا اور چنگھاڑا۔ پر اس کی چنگھاڑ اُن کیلئے مطلقاً تشویش انگیز نہ تھی۔

فتح کے پھریرے لہراتے وہ ٹھکانے پہنچے۔ جب اُن کے خراٹے گونجنے لگے۔

تب وہ جوفیالز گاڑی میں بیٹھا اور بغداد کے لیے روانہ ہوا۔ گرین زون صدام کا محل امریکی ہیڈکوارٹر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ کھڑی رکاوٹوں سے گزرتا، تعارف اور شناخت کرواتا انچارج سیکورٹی کے پاس پہنچا۔

اس وقت وہاں موجود کرنل رینک کا عراقی فوجی افسر تھا اور اس نے اِس کیس کا سارا کچا چٹھا اُسے سُنا دیا اور تصویریں بھی دکھا دیں۔ کرنل ابراہیم دم بخود تھا۔ عراق کی ممتاز اور سرکردہ فیملی۔ وحشت اور ننگی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

اب امریکن فوجی افسر ہر صورت اِس گینگ ریپ اور قتل کی لرزہ خیز واردات کو غیر موثر بنانے پر تُلے تھے۔ نورالمالکی کی طفیلی حکومت کا ٹولہ مجرموں کے کورٹ مارشل پر مُصر

تھا۔ گرینڈ جیوری نے کیمپ لبرٹی میں کیس کی سماعت میں کہا کہ آخری فیصلہ امریکی جنرل کرے گا کہ کورٹ مارشل ہونا چاہیے یا نہیں۔

صفائی کے وکیلوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کیس مضبوط کر دیا تھا کہ بیچارے ملزمان دہشت گردی کی مریضانہ حالت میں تھے۔ ان کی بٹالین کے سترہ ساتھی عراقی مزاحمت کاروں کے خودکش حملوں میں مارے گئے تھے۔ وہ تو نارمل اخلاق باختہ جنسی مجرموں کی فہرست میں ہی نہیں آتے ہیں۔

ایسے ہی کارنامے معویت نام میں ہوئے۔ دُنیا کی مہذب اور سُپر پاور قوم کے افراد۔

17-04-2012 پاکستان

لمحہ فکریہ

ایک پہلو اور بھی تخریب میں تعمیر کا

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

یہ 1986ء کی بات ہے۔اُن خوبصورت دنوں کی جب پاکستان میں سیاحوں کی بھیڑ تھی۔شمالی علاقہ جات میں ان کے پُرے تھے۔کہیں کوہ پیمائی ہو رہی ہے کہیں علاقائی زبانوں پر ریسرچ ہو رہا تھا۔مجھے یاد ہے جب میں بلتستان پر لکھنے کیلئے سکردو جا رہی تھی۔بون یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کلازسیگاسٹر بلتی زبان پر تحقیق و ریسرچ کے سلسلے میں میرے ساتھ ہی جہاز میں سوار ہوئے تھے۔میں حیران تھی غیر مُلکی لوگوں کے تحقیقی جذبوں اور جانفشانیوں پر کہ وہ ایک چھوٹے سے دشوار گزار اور دُور افتادہ علاقے میں دو ڈھائی لاکھ لوگوں کی زبان پر تحقیق کرنے کیلئے کہاں سے کہاں پہنچے تھے۔

میں بلتستان کی مرکزی وادی سکردو سے شگر گئی۔وادی شگر میں جہاں دُنیا کی دوسری بڑی چوٹی کے ٹو ہے میرا قیام اسسٹنٹ کمشنر داؤد صاحب کے ہاں تھا۔وادی شگر میں غیر مُلکی سیاحوں کی بھیڑ تھی۔کہیں کے ٹو پر جانے والی جرمن، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی کوہ پیما ٹیموں کے جتھے تھے۔

داؤد صاحب کو بہت سارے گلے شکوے تھے جن میں سرفہرست بلتستان اور گلگت کی آئینی حیثیت تھی۔شمالی علاقہ جات کے لوگ محبّ وطن، پُرامن اور نیک نیت ہیں۔جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جنگِ آزادی خود لڑی اور اپنی مرضی سے پاکستان میں شامل ہوئے اور آج بھی اس کی محبت میں سرشار ہیں لیکن کوئی بھی قوم اتنے طویل عرصے تک بغیر کسی آئینی حیثیت بغیر بنیادی انسانی حقوق کے نہیں رہ سکتی۔آج سوچتی ہوں کہ کتنے سالوں بعد یہ پانچواں صوبہ بنا۔

بلتستان مسلک کے اعتبار سے فقہ جعفریہ سے منسلک ہے۔98% فی صد شیعہ، 1.5% فی صد سُنی اور 0.5% آغاخانی ہیں۔خپلو اور اس سے آگے کا علاقہ نوربخشی مسلک سے وابستہ ہے۔یہ انتہائی معتدل مزاج مذہبی لوگ ہیں۔

خپلو سے میں چھور بٹ کیلئے جب روانہ ہوئی میں نے دیکھا اِس اتنے دشوار گزار راستے کی سڑک بلند اور پُرہیبت پہاڑوں کے باوجود بہتر اور ذرا کشادہ تھی۔نیچے ہزاروں فٹ گہرائی میں دریائے شیوق میں بہتا ہے۔مجھے سیاچن گلیشیر کے دامن میں بسنے والی وادی چھور بٹ جانا تھا۔پیون میں آرمی ہیڈ کوارٹر ہے اور گیاری سیکٹر کیلئے رسل و رسائل کے انتظامات یہیں سے کیئے جاتے تھے۔یہاں نالہ چھور بٹ دریائے شیوق میں گرتا ہے۔

چھور بٹ ضلع کا صدر مقام وادی سکسہ ہے جہاں سکردو ڈگری کالج کے پرنسپل خواجہ مہرداد خان کے شاگرد کا خاندان رہتا ہے اور مجھے دو دن اس خاندان کے ساتھ رہنا تھا۔اِس گھر کا بڑا بیٹا کیپٹن کاظم سیاہ چن پر متعین تھا اور اُن دنوں چُھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔جس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ہم سیاچن گلیشیر کے زیر سایہ رہ رہے ہیں۔قطبین سے باہر دُنیا کا یہ سب سے بڑا گلیشیر فوجی اور سیاسی اہمیت کا حامل جہاں پاکستانی فوج آٹھ ہزار آٹھ میٹر بلندی پر ننگی برف کے سمندر میں دھنسی دُنیا کی انوکھی اور فضول لڑائی لڑنے میں مصروف ہے۔

ہماری بلتی زبان میں "سیا" جنگلی گلاب کو کہتے ہیں۔سفید پیلے اور گلابی رنگ پھولوں والا یہ سخت جان پودا ہی یہاں اُگتا ہے"چن" کا مطلب والا سے ہے۔یعنی جنگلی گلابوں والا 75 کلومیٹر لمبا، 5 سے 7 کلومیٹر چوڑا اور تقریباً 21000 ہزار سے 24000 ہزار فٹ تک بلند قطبین سے باہر یہ دُنیا کا سب سے بڑا گلیشیر ہے۔مختلف اوقات میں مختلف غیر مُلکی کوہ پیماؤں اور سیاحوں کی ٹیموں نے حکومت پاکستان کی اجازت سے اس کی بعض چوٹیاں اور دروں کو سر کرنے کی کوشش کی تھی۔

کیپٹن کاظم نے چائے کا خالی پیالہ ٹرے میں رکھتے ہوئے دُکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔1971ء میں مشرقی پاکستان پر قبضے کے بعد ہندوستان کا دماغ

خراب ہوگیا تھا وہ اپنے آپ کو جنوبی ایشیا کی زبردست طاقت بنانا اورمنوانا چاہتا تھا۔ نیفا میں چینیوں کے ہاتھوں شکست کا زخم بھی اس کے سینے پر تھا۔اسی لئے 1984ء میں اس نے سیالا اور بلافون دو اہم پاکستانی دروں پر قبضہ کرلیا۔اس کا ارادہ بیک وقت چین اور پاکستان کو سبق سکھانے کا تھا۔نتیجتاً سمندر میں ایک نرالی اور عجیب وغریب لڑائی کا آغاز ہوگیا۔جو جانے کب تک جاری رہے گی۔

پاکستان آرمی کیلئے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔شدید سردی، آکسیجن کی کمی، زیادہ بلندی پر پیدا ہونے والے عارضے جن میں فراسٹ بائٹ(Frost Bite) سرفہرست ہے۔راشن ایمونیشن مٹی کے تیل اگلوز اور جدید ہیلی کاپٹروں کی فراہمی ایسے مسائل فوری حل طلب تھے۔

آپ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں کہ جہاں اس وقت آپ بیٹھی ہیں۔کیپٹن کاظم نے گفتگو کا سلسلہ توڑتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا۔

اس کے عین اُوپر گرمیوں کے اس موسم میں بھی درجہ حرارت منفی 10 سے 15 سینٹی گریڈ رہتا ہے۔برف کے اس خوفناک سمندر میں چلتے ہوئے آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ گہری برفانی کھائیاں اور اندھے کنوئیں بھی آپ کے منتظر ہیں۔اچھے بھلے موسم میں ایکا ایکی خوفناک برفانی ہوائیں اور زبردست برفباری اگلو میں بیٹھے ہوئے بھی آپ کا خاتمہ کرسکتی ہیں۔آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا پہاڑوں کی چوٹیوں سے سلائیڈ ز گر کر پل بھر میں آپ کو دوسری دُنیا میں پہنچا دیتی ہیں۔آپ نہیں جانتے کب اور کس وقت آپ اچانک فراسٹ بائٹ کا شکار ہو جائیں گے۔

یہ سب تکلیفیں یہ سارے عذاب اور یہ ساری صعوبتیں ہمارے جوانوں اور افسروں کے سامنے ہیـــــچ ہیں۔میں آپ کو قائداو۔پی کے معرکے کی تفصیل سناؤں کہ نائب صوبیدار عطامحمد نے کس جوانمردی سے دشمن کے تین بڑے حملوں کو پسپا کیا اور شہید ہوا۔10000 ہزار فٹ کی بلندی پر بلافون سیکٹر میں معرکہ حق و باطل کیسے ہوا؟ کیپٹن محمد اقبال اور کیپٹن سالک چیمہ نے ثابت کیا کہ مومن کیسے ہوتے ہیں اور ان کے فولادی عزم کے سامنے پہاڑ روئی بن کر کیسے اُڑتے ہیں۔معرکہ چھولک کا ذکر کروں کہ کیپٹن محمد جاوید اور کیپٹن غلام جیلانی نے ناممکن کو کیسے ممکن بناتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا۔

22000 ہزار فٹ کی بلندی پر سلنگ سے اُتارے جانے والے جوانوں کا ذکر کروں اور یہ بھی بتاؤں کہ پہلی بار جب ہیلی کاپٹر سے لیفٹیننٹ نوید اور نائک یعقوب کو ان کے زبردست اصرار پر سلنگ سے اُتارا گیا تو انہوں نے 76 گھنٹے وہاں کیسے گزارے۔کیپٹن کامران اور میجر بلال نے گنگا بیس کو کیسے تباہ کیا۔

چند ایک نہیں سینکڑوں ایسے کارنامے ہیں جن پر پوری قوم ناز کرسکتی ہے سچی بات ہے مجھے وہ شعر بڑا حسب حال لگتا ہے ۔ کہ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔

کیپٹن کاظم ہنسا۔

ایک پہلو اور بھی تخریب میں تعمیر کا۔سیاچن کی لڑائی نے ہمارے بلتستان کے وہ پسماندہ علاقے بھی ترقی یافتہ کردیئے ہیں جن کے آئندہ پچاس سالوں میں آگے بڑھنے

کے امکانات زیرو فی صد تھے۔ہمارے انجینئر پہاڑوں اور گلیشیر وں کو کاٹ کاٹ کر سڑکوں کا جال بچھا رہے ہیں بجلی کی فراہمی کو ممکن بنا رہے ہیں۔لوگوں کو روزگار مل رہا ہے اور ان کی معاشی حالت بدل رہی ہے۔

یہ 1986ء کی بات ہے اس کے چند سالوں بعد جب میں پھر سکردو گئی۔مجھے وہاں کے لوگوں سے پتہ چلا کہ سکردو سے سیاچن گلیشیر تک کی سڑک اور علاقوں کی معاشی حالات میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ملحقہ وادیوں کے لوگ اب روزگار کیلئے سکردو نہیں آتے بلکہ چھور بٹ گیاری سیکٹر کی طرف جاتے ہیں۔

لیکن حالیہ حادثا تنا پُر الم ہے کہ دُکھ اور افسوس کے ساتھ ساتھ یہ دُعا بھی ہے کہ یہ جنگ وجدل اب ختم ہوں انہوں نے انسانیت کو کچھ دینے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ لیا بھی ہے۔

22-04-2012 پاکستان

لمحہ فکریہ

گورنر ہاؤس کے سبزہ زاروں پر احوال ایک تقریب کا

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

مہمان تو وہ دونوں تھے ۔ماضی کی خوبصورت اداکارہ شبنم جس کی آنکھوں میں بنگال کا جادو بولتا ہے اور روبن گھوش دنیائے موسیقی کا منفرد موسیقار۔ساتھ میں شبنم کے شوہر کی اضافی خوبی بھی جُڑی ہوئی ۔آواخر اپریل کی بے حد خوبصورت اور دلنواز شام جو گورنر ہاؤس کے سرسبز و شاداب اور وسیع و عریض لانوں پر بکھری پڑی تھی ۔بڑا خوابناک سا ماحول جس میں اُڑتی روبن گھوش کی موسیقی میں پرانے گیتوں نے نئے گلوروں کے ساتھ سماں باندھ دیا تھا۔

بلاشبہ پی ٹی وی کا یہ ایک مستحسن اقدام تھا پرانے فنکاروں کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے۔اچھی روایت ہے مگر یہ روایت چمکتے ستاروں کے ساتھ ساتھ اگر گمنامی میں چلے جانے والوں کیلئے بھی ہو جائے تو بہت خوش آئند بات ہوگی ۔

یہ تقریب ایک مہنگی اور انتہائی کروفر والی تھی ایک ایسے وقت میں جب لیاری کی گلیوں اور سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا۔بھوجا ایر لائن کے مسافروں کے لواحقین کے آنسو رخساروں پر ہیں ۔سیاچن گلیشیر کے مجاہدین ابھی تک منوں برفوں تلے دبے ہوئے ہیں ۔

ہمارے حکمران بھی ماشا ئاللہ سے کیا رنگ رنگیلے ہیں ۔پروگرام ہفتہ اٹھائیس اپریل کی رات کو تھا۔ریہرسل ایک دن پہلے گورنر ہاؤس کے سبزہ زاروں پر ہو رہی تھی۔فنکار اور فنکاروں کے ہجوم تھے جن میں کچھ سنجیدہ مزاج لوگ بھی تھے ۔ہمارے گورنر صاحب ماشاءاللہ سے جوگنگ سوٹ میں ملبوس انہی سبزہ زاروں پر جوگنگ کرتے پھرتے تھے ۔پانی کی بوتل ہاتھ میں تھی تھک جاتے تو آکر آرٹسٹوں سے گپیں مارتے ۔

چند انقلابی نوجوانوں کو گورنر صاحب کی اِس درجہ فراغت بہت کھلی ۔دُکھ بھرے لہجے میں اظہار تھا۔کوئی کام نہیں ہے کرنے کو۔مُلک میں ہر طرف کیا سکھ چین کی بانسری بج رہی ہے جو یہ مزے کر رہے ہیں ۔

بیچارے نوجوان لڑکے تاریخ کی حقیقت کو شاید اتنا نہ جانتے ہوں کہ قومیں جب زوال پر آتی ہیں تو پھر نیرو جیسے حکمران بانسری بجاتے ہیں اور مُلک جلتے ہیں ۔ہمارے ہاں یہی تو سب کچھ ہو رہا ہے ۔

صدر صاحب اپنے محل سے باہر قدم نہیں نکالتے ۔شیشے کے گھر میں بیٹھے ہیں ۔

اور جناب گیلانی صاحب عدالت کے قضیوں میں گھرے کرسی بچانے کے چکروں میں ۔عزت اور وقار جائے بھاڑ میں ۔

پروگرام میں کوئی ایک مُلکی شخصیت تھوڑی تھی جناب قمر زمان کائرہ ، جناب امین فہیم ، جہانگیر بدر کی تشریف آوری ہوئی ۔اُن کے تھوڑی دیر بعد لطیف کھوسہ صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ تشریف لائے اور پھر گاڑیوں کی گھن گرج میں وزیر اعظم کی آمد آمد ہوئی ۔جناب یوسف رضا گیلانی ڈھیر سارے کمانڈوز اور ڈھیر ساری پولیس نفری کے ساتھ شبنم سے ملنے آئے ہیں ۔

کوئٹہ جل رہا ہے ۔ہزارہ قبیلے کے لوگ اور دیگر قومیں کیسے دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں ۔وہاں جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے ۔بلوچستان کوئی ہمارا تھوڑی ہے؟

درست ہے کہ کسی بھی صحت مند معاشرے میں رواداری، امن اور ہارمنی Harmony کیلئے فنون لطیفہ کا فروغ اور اس کی سرپرستی بہت ضروری ہے لیکن یہ کیا کہ مُلک اتنے گھمبیر مسائل کا شکار ہو تو اتنے اللّے تللّے کیے جائیں ۔

شبنم کا عروج پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد ہوا۔ دولت، عزت، شہرت انہوں نے یہاں کمائی۔ پھر وہ اپنی مرضی سے بنگلہ دیش چلی گئیں اور یقیناً وہ وہاں وہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی نہ حاصل کر سکیں جو انہیں یہاں حاصل تھی۔ اس کا اظہار انہوں نے ڈاکٹر عمر عادل کے ساتھ کیا۔

اب گیارہ ہزار ڈالر کا نذرانہ، آنے جانے اور پی سی میں قیام و طعام کا خرچا لگ۔ اس کے ساتھ اس پروگرام کے پروڈیوسر اور دیگر فنکاروں کے بلانے اور فائیو سٹار ہوٹلوں میں ٹھہرانے اور وسیع پیانے پر اخراجات کی بھرمار۔ کیا پی ٹی وی کیلئے ایسے اسراف ضروری ہیں۔ اسے کم خرچ کے ساتھ بھی کیا جا سکتا تھا۔

بہر حال یہ رونے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اب ذرا ساٹھ کی دہائی کے آخری سالوں کے بہت خوبصورت گیت ''کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں وہ بہاریں وہ سماں'' ندیم کی زبان سے سُننا کتنا پُر لطف تھا۔ ندیم اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ دسمبر 1969ء میں جب وہ فلمساز احتشام کا داماد بنا تھا۔ میں احتشام کی مسز نجمہ احتشام کا اخبار خواتین کیلئے انٹرویو لینے ڈھاکہ ان کے گھر گئی تھی جہاں وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ اپنی سُسرال آیا اور میں نے اُسے دیکھا تھا۔ وہ اتنا ہی خوبصورت تھا جتنی تعریف کی جائے۔

کل اور آج دونوں سامنے تھے اور فضا میں اُس کی آواز بکھری تھی جو یقیناً ابھی بھی خوبصورت تھی۔

پاکستان کی لیجنڈری ورسٹائل سٹار بشریٰ انصاری پروگرام کی کمپئرنگ کر رہی تھیں اور جیسے پروگرام کو چار چاند لگ گئے تھے۔

وزیر اعظم کو بلایا گیا۔ بشریٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے۔ حال میرے دل کا تمام لکھ دے'' اور وزیر اعظم نے کہا'' آپ کو بھی توہین عدالت کے سلسلے میں سزا ہو سکتی ہے۔''

بشریٰ انصاری احمد بشیر جیسے سچے اور کھرے صحافی کی بیٹی ہے۔ ابھی چند دن پہلے کسی نے اُس سے بھوجا ایرلائن کے جہاز کے کریش کے بارے میں پوچھا۔ یہ جہاز یہ گولے یہ بم سب غریبوں پر کیوں برستے ہیں۔ ارے یہ کیبنٹ پر کیوں نہیں گرتے۔ کمبخت ماروں کا صفایا ہو۔

بیان آن ایر On-Air ہوا تو خیر خواہوں نے فون کیے اور کہا۔ تمہارا یہ بیان کہیں مصیبت ہی کھڑی نہ کر دے۔ بھئی سچی بات تو کہنی ہے نا۔ میں آخر کس باپ کی بیٹی ہوں۔

اِس تقریب کا سب سے دلچسپ پہلو اُس کا آخری آئٹم تھا جہاں تقریب کے اختتام پر ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب مہمانوں کیلئے کھانے کے نام پر خالی کھڑکھڑاتے برتن تھے۔ نیلم احمد بشیر، میں اور سنبل جس کنوپی کی طرف بڑھتے جس برتن کا ڈھکن اُٹھاتے وہ خالی منہ چڑاتا تھا۔

میں نے سوچا میرے بیچارے ڈرائیور کو کیا ملا ہوگا۔ پوچھا تو بولا۔ لو باجی ہم لوگوں نے تو دبا کے کھایا۔ ہم سب لوگوں کو انہوں نے اکٹھا کیا اور کہا۔ ایسی کی تیسی اس ایلیٹ کلاس کی۔ بھر لو پلیٹیں اور کھاؤ ڈٹ کے۔ بس تو پھر لان تھے جہاں ہم پھسکڑا مار کر بیٹھے اور ہماری چوٹی تک بھری ہوئی پلیٹیں تھیں۔

نیلم اور میں کھلکھلا کر ہنسیں۔ ہماری اس ہنسی میں یقیناً انقلاب کی خوشبو کی ایک مہک تھی۔

04-05-2012 پاکستان

لمحہ فکریہ

ہم پاکستانی ادیب آخر کیوں بے حس ہیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

حکمران دُنیائے اوّل کے ہوں دوم یا سوم کے کرسیوں سے سالوں تک چمٹنے کے شوق ان میں جبلی ہوتے ہیں۔ استثنائی کیس کی میں بات نہیں کرتی۔ ہاں اگر فرق ہوتا ہے تو صرف اُن ضابطوں اور طور طریقوں کا جو اِن ترقی یافتہ مُلکوں نے وضع کر رکھے ہوتے ہیں اور جو اُن کے حکمرانوں کی بے مہار خواہشات کو لگام ڈال دیں۔ اور وہ اپنی مقررہ مدّت پوری کرنے کے بعد قاعدے قانون کے تحت اپنی کرسیاں چھوڑ دیں۔ گو یہ کلیہ بھی ہر ترقی یافتہ مُلک پر لاگو نہیں آتا کہ اُن کا حکومتی طبقہ ایسی اخلاقیات کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے۔ تیسری دُنیا کی تو بات ہی کیا۔ اس کے حالات تو یوں ہی گرگوں ہیں کہ وہاں تو آرزوؤں کا پسپا رہی اتنا پھیلا ہوا ہے۔ دس پندرہ سال تو اونٹ کے منہ میں زیرے جیسے محسوس ہوتے ہیں۔ گلی گلی تماشا کروا کر اور گو گو go go کے نعرے لگوا کر اگر کہیں چھٹکارہ مل جائے تو پھر بھی مڑ مڑ کر دیکھا جاتا ہے کہ دوبارہ کرسی پر بیٹھنے کے امکانات کتنے ہیں۔ اب جب سے ولادی میر پیوٹن تیسری ٹرم کیلئے منتخب ہوئے ہیں۔ لوگ باگ جلوسوں پر جلوس نکال رہے ہیں۔

تین دن پہلے سی این این CNN پر ماسکو کے گلی کوچوں میں انسانوں کا ایک جمِ غفیر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ماسکو کے ڈاؤن ٹاؤن کی سڑکیں گلیاں انسانوں سے بھری پڑی تھیں۔ کوئی بارہ تیرہ ہزار کا مجمع تو ہوگا ہی۔ ولادی میر پیوٹن تو یوں بھی ہیرا پھیریوں، دھاندلیوں، اپنے مخالفین کو قتل کروانے میں خیر سے بڑا اتگڑا ہے۔ جس طرف صاحب کا اشارہ ہو جائے ایف ایس بی والے (سابقہ کے جی بی) سمولچا بندہ غائب کر دیتے ہیں۔

2009ء میں ماسکو میں مجھے نوایا کی ایک جرنلسٹ نے بتایا تھا کہ چیچنیا پر روسی افواج کے حملوں کے خلاف ماسکو کی ایک دلیر جرنلسٹ Anna Politkovskaya نے بڑی جی داری سے لکھا اور نتیجہ کیا ہوا اُسے دن دیہاڑے ماسکو شہر کے دل میں قتل کروا دیا گیا۔

اب تیسری بار پیوٹن پھر دھاندلیوں کے موڈھوں پر چڑھ کر کریملن کے تخت پر براجمان ہو گئے ہیں۔ الیکشن شفاف نہیں ہوئے۔ دھاندلی ہوئی۔ احتجاجی جلوس نکلے۔ پولیس نے دھکے شپکے لگا کر ہجوم منتشر کروایا۔ مگر 12 مئی کو لوگ پھر سڑکوں پر تھے اور لطف کی بات چوٹی کے لکھاری اس ریلی کو لیڈ lead کر رہے تھے۔ ڈاکٹر لدمیلا مشرقی زبانوں کی ماہر ہیں اور اُردو ایسے بولتی ہیں کہ کیا اہل زبان بولیں گے اس جلسے میں شامل تھیں۔ روسی ناول نگار بورس اکنن Boris Akunin جن کے ناول دُنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر قارئین سے مقبولیت کی سند پا چکے ہیں موجود تھے۔ مُلک کے نامور موسیقار شامل ہوئے۔ ادیبوں کی شرکت کی بڑی وجہ پولیس کے اُس اقدام کے نتیجے میں تھی کہ جب چند دن پہلے کے احتجاج میں انہوں نے چند سڑکیں بلاک کیں۔

ڈاکٹر آرینا بھی مشرقی زبانوں کی ترویج و ترقی سے منسلک ہیں۔ میرے فون کرنے پر بولی تھیں۔ روسی ادیب یہ سوال لے کر احتجاج میں گئے تھے کہ وہ پوچھیں کہ ماسکو کے شہریوں کو اپنی گلیوں بازاروں میں پھرنے کیلئے کس سے اجازت لینی ہے؟ انہوں نے پلے کارڈ Play Card ہاتھوں میں اُٹھا رکھے تھے۔ اُن کی شمولیت نے اِس احتجاجی ریلی کو کتنا بڑا اور موثر بنا دیا۔ صرف اس لئے کہ روسی کتاب سے محبت کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں ادیبوں کی کتنی تنظیمیں ہیں۔ ہمارے ہاں مسائل کتنے گھمبیر ہیں۔ بجلی، گیس، مہنگائی، منفی سیاسی ہتھکنڈے۔ چلیں باقی کو تو چھوڑیں بجلی جو انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ہم ادیب آخر کیوں اتنے بے حس ہیں؟ کیوں نہیں نکلتے؟ کیوں نہیں احتجاج کرتے؟ ہم میں یہ بے حسی اور جمود آخر کیوں ہے؟ ہم کب اُٹھیں گے اپنی موجودگی کو موثر اور طاقتور بنائیں گے؟ کب ہماری قوم کتاب سے محبت کرنا سیکھے گی؟

پاکستان 20-05-2012

لمحہ فکریہ

نذیر ناجی کی خدمت میں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

19 مئی کے جنگ میں جناب نذیر ناجی کے کالم "بات معافی کی نہیں" میں کہ جہاں چند جگہوں پر وہ صدام، کویت خلیج اور امریکہ کے بارے میں بات کرتے اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہیں مجھے اُن کی حیرانی پر حیرت ہوئی ہے۔ کیا ہم نے اِس سے پہلے ایران عراق جنگ کو نہیں دیکھا۔ اس کے پس منظر میں کام کرتے عوامل ہمارے سامنے نہیں تھے۔ یہاں میں صرف ایک اہم نکتے کا ذکر کروں گی کہ ایران عراق جنگ میں اگر امریکہ عراق کو سپورٹ sport کر رہا تھا تو وہیں ایران کو فاضل پُرزوں اور جنگی سامان کی تیز ترین سپلائی اسرائیل کی طرف سے ہو رہی تھی۔ اب صورت حال کو قارئین بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ صدام کا کردار کیا تھا اسے چھوڑیئے۔ اِس بڑے تناظر میں دیکھیے کہ اسلامی مُلکوں کی بے اعتنائی، خود غرضی اور کمزوری کہ وہ امریکہ کے ڈر سے دو مسلمان مُلکوں میں صُلح نہیں کروا سکے۔ اپنے اپنے مفادات اور اقتدار کو بچانے کیلئے دو بڑی مسلمان طاقتوں کو کمزور اور ان کی نئی نسل کو خزاں کے پتوں کی طرح جھڑتے دیکھا اور اپنی کچھاروں میں مگن رہے۔

اب خلیجی جنگ اور عراق پر قبضہ تو یہ بھی اُس کھیل کا ہی ایک حصّہ تھا۔ صرف صدام ہی کویت کو اپنا حصّہ نہیں سمجھتا تھا بلکہ یہ حقیقتاً بغداد کا حصّہ تھا۔

کویت کا بطور خود مختار ریاست وجود ہر عراقی حکمران کو برداشت نہیں ہو رہا تھا اور وہ کویت کو بصرہ صوبے کا ایک حصّہ سمجھتے تھے۔ شاہ غازی جن کی مدّت حکمرانی 6 سال تھی یعنی 1933ء سے 1939ء تک کے وقت میں اپنے نجی ریڈیو سے مسلسل اہلِ کویت پر زور دیتے رہے کہ وہ جابر اور گماشتہ شیخ سے نجات حاصل کریں۔ تیل تو ابھی کہیں دریافت کے مرحلوں میں تھا۔ دراصل اِس پورے علاقے میں برطانیہ نے اپنے تسلط کے دوران خلیجی سماج کے پرانے سماجی نظام یعنی قبائلی نظام سرداری کو وضع کِیا اور مضبوط بھی کِیا۔ کویت میں یہی ہوا۔ تیل دریافت ہوا تو معلوم ہوا کہ دُنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ تو کویت میں ہے۔ شیخ اور کویت دونوں بہت اہمیت کے حامل ہو گئے۔ اندھی دولت کا بڑا حصّہ لندن کے بینکوں اور اسٹاک ایکسچینج Stock Exchange میں جمع ہونے لگا اور کویت برطانیہ کی جان بن گیا تھا۔

جنرل قاسم بھی اپنے دورِ اقتدار میں کویت کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی جنگ سے اسے قابو کرنا چاہتا تھا۔ کویت نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ نے کہا فکر کی ضرورت نہیں۔ اندرونی و بیرونی حملے کی صورت برطانیہ مدد کرے گا۔

جنرل قاسم کی پیشکش کہ انہوں نے عام کویتوں کی معاشی حالات کو بہتر بنانے کی بات کھُل کر کی اور یہ بھی کہ شیخ کو صوبہ بصرہ کے ضلع کویت کا گورنر بنا دیں۔ اِس اندر خانے پلتی بغاوت کو ختم کرنے کیلئے برطانیہ کو کتنی محنت کرنی پڑے یہ اپنی جگہ ایک داستان ہے۔

تیس سال بعد صدام کو بھی کویت کھٹک رہا تھا۔ صدام انا کا مارا ہوا حکمران تھا۔ جمال عبدالناصر بننے کی تمنا تھی اُسے۔ نہر سویز کی طرح کویت پر قبضے سے وہ بھی ہیرو بننے کا متمنی تھا۔ یوں چند شکایات بھی تھیں۔ کویت خلیجی گروہ کا رکن ہوتے ہوئے بھی اپنے منافع کی خاطر سستا تیل بیچ کر اوپیک OPEC کو دھوکا دے رہا ہے۔ اُس کے آئل فیلڈ Oil Field سے تیل چوری کیا ہے۔ ضروری ہے کہ اُس کی تلافی کرے۔

یہ سب چیزیں نشان دہی کرتی تھیں کہ آئندہ کیلئے صدام کے عزائم کیا ہیں۔ سیاسی بصیرت کا فقدان کہ امریکہ کو دوست سمجھ رہا تھا۔ اعتماد کر رہا تھا۔ امریکی سفیر اپریل گلاس پائی کو دعوت دی جاتی ہے۔ یہ ملاقات ون ٹو ون One to One ہے۔ کمرے میں دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ مترجم بھی نہیں کیونکہ گلاس پائی

بہت اچھی عربی بولتی تھی۔ یہاں اُسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا۔اُس نے جواباً جو کہا وہ کچھ یوں تھا کہ وہ عراقیوں کے خدشات سمجھتی ہے۔سٹیٹ ڈپارٹمنٹState Department کی خواہش ہے کہ عرب دُنیا اپنے معاملات اور تنازعات کو فریقین کی رضامندی سے حل کرے۔امریکی مفادات میں ظاہر ہے شاہ ایران کے بعد صدام متبادل صورت میں موجود تھا مگر کہیں بھی حملہ کرنے کیلئے واضح اشارہ موجود نہیں تھا۔یہ ملاقات سب سے زیادہ زیرِ بحث رہی کہ گلاس پائی کی طرف سے واضح اشارہ ملنے پر صدام نے حملہ کیا۔

کویت ایک بھی عراقی مطالبہ ماننے پر تیار نہ تھا۔سعودی شاہوں کی کوششیں بھی ناکام ہوئیں۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کیا کویت کو امریکی شہہ حاصل تھی۔بہر حال حملہ ہوا قبضہ ہوا۔صباخاندان کا تختہ اُلٹ کر تیل کی تنصیبات کو قبضے میں لے لیا گیا۔کویتی صباخاندان سے ناکوں ناک آئے پڑے تھے۔قبضے کے بعد فی الفور الیکشن کروا کے ایک ایوان وجود میں لایا جاتا تو صدام اُن کی یہ مہم کامیاب ہو جاتی۔ویسٹ نے سر پکڑ کر بیٹھ جانا تھا مگر اتنی بصیرت کہاں سے آتی۔اور اگر ایسا کر بھی لیتا تو عراقی عوام جسے نکیل ڈالی ہوئی تھی وہ بھی کھڑی ہو جاتی۔

اب یہاں پھر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ عراقی پڑھی لکھی قوم ہے۔کیا وہ جمہوریت کے قابل ہے یا وہ آمریت کے سائے میں ٹھیک رہتی ہے؟

بغداد میں مجھے ایک اُستاد نے کہا۔

صدام کے دور میں ہماری زبانیں بند تھیں مگر امن اور سکون تھا۔اب ہماری زبانیں کُھل گئی ہیں مگر امن غارت ہو گیا ہے۔

پاکستان 25-05-2012

لمحہ فکریہ

مصر کے انتخابی نتائج

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

یہ کوئی 2007ء کی بات ہے۔

نیل کے پانیوں پر تیرتا، کروز The great prince لکسر سے اسوان کی طرف رواں دواں تھا۔ میں عرشے پر کھڑی نیل کے پانیوں کو دیکھتے ہوئے اُس کی عظمت، اُس کی قدامت، اُس کی تاریخی اہمیت کے سحر میں گُم ہونے کے ساتھ ساتھ نیل کے دونوں کناروں پر زردئی پہاڑیوں، گنّے اور کیلے کے کھیتوں، مٹی رنگے کچے پکے مکانوں اور نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بہت سی حیرتوں کا سامنا کر رہی تھی کہ کیلوں کو کھیتوں کی صورت میں اُگے دیکھنا حیرت انگیز تجربہ تھا۔ جب کروز ایدفو شہر کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ ایدفو چھوٹا سا خوبصورت شہر ہورس دیوتا کے ٹمپل کی وجہ سے بہت شہرت کا حامل ہے۔

جیٹی پر قدم دھرے۔ خشکی پر آئے۔ لشکارے مارتے تانگے مسافروں کو ٹمپل لے جانے کیلئے آوازیں لگاتے تھے۔ محمد نامی کوچوان کے تانگے میں بیٹھے۔ مسلمانیت سے بھرا ہوا بندہ تھا۔ پاکستانی جان کر چابک لہراتے ہوئے کُھلے ڈُلے انداز میں الحمد اللہ، الحمد اللہ کوئی چار بار کہا ہوگا۔ امریکہ کو تبرّوں سے نوازا۔ اسامہ بن لادن کے گلے میں گلابوں کے ہار ڈالے۔ حُسنی مبارک کو کوسنوں سے نوازا۔ افغانستان اور فلسطین کیلئے دُعائے خیر کی۔

''اللہ اللہ میرے اللہ اسلام کا بول بالا ہو۔ ہم نے بھی دل کی گہرائیوں سے آمین آمین کہا تھا۔

''یہ حُسنی اب اپنے لڑکے کو تیار کر رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں غصّے کا عنصر تھا۔ مجھے اولڈ قاہرہ کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے چھوٹے چھوٹے گھروں کے لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے اندازہ ہوا تھا کہ اُن میں دین سے محبت کس حد تک ہے۔

جامعہ الازہر میں وزٹ کے دوران اسلامک اینڈ عرب سٹڈی ڈیپارٹمنٹ کے ایک سینئر پروفیسر نے بڑی رازداری سے مجھے بتایا تھا۔

مصر میں انقلاب آنے والا ہے۔ آپ دیکھیے گا۔ اسلام پسند عناصر غالب آجائیں گے۔ امریکہ کے پٹھو زیادہ دیر تک ہمیں نہیں دبا سکیں گے۔ بہت اضطراب ہے لوگوں میں۔ پھٹ پڑیں گے ایکدن یہ۔

فوج کے بارے میں ایک سوال پر اُس نے پھر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے میرے ساتھ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے کہا تھا۔

''صرف اُونچا طبقہ امریکہ کے مفادات کیلئے سرگرم عمل ہے۔''

مختلف لوگوں سے پوچھنے پر کہ یہاں کون کون سی سیاسی جماعتیں ہیں مجھے معلوم ہوا تھا کہ سیاسی طور پر مُلک میں یک جماعتی نظام ہے۔ ہاں البتہ لوگوں کی ہمدردیاں اخوان المسلمین کے ساتھ ہیں۔ یہ سب سے بڑی اور مضبوط جماعت جس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے، جس کے بے شمار لوگ ابھی بھی جیلوں میں ہیں فوج کا اُوپر کا طبقہ جسے سخت ناپسند کرتا ہے لیکن آفرین ہے ان لوگوں پر کہ یہ تمام لوگوں کے ہر دُکھ سکھ میں شامل ہوتے ہیں۔ فلاح و بہبود کے بے شمار ادارے اس جماعت کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ یہ مختلف وقتوں میں مختلف ناموں سے اپنے آپ کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی پر پہرے تھے۔ کچھ منت سماجت پر بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ یہی کچھ اسکندریہ یونیورسٹی میں ہوا۔ میں بھی ڈھٹائی سے کھڑی ہو کر بولنے لگی تھی کہ درسگاہوں پر اِن پہروں کی کیا تُک؟ چند لڑکے رُک گئے۔ ایک نے صاف ستھری انگریزی میں کہا تھا۔ امریکہ اور اسرائیل کو خوش کرنا مقصود ہے۔ یہ حُسنی تو نرا پٹھو ہے اُن کا۔

پھر پاکستانی جان کر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ اُن میں دو اخوان المسلمین جیسی جماعت ایک النور پارٹی سے تھا۔ یہ بھی کوئی اسلامی نظریات رکھنے والی پارٹی

ہے جس کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ ذرا انتہاپسند اور وہابیت کی طرف مائل ہے۔

پورے ساڑھے چار سال بعد التحریر میدان میں لوگوں کے اُبلتے کھولتے جمِ غفیر نے اس کو سچ ثابت کیا۔

پورے تیس سال بعد حُسنی مبارک اپنے اختتام پر پہنچ گیا تھا۔

اب جب میں مصر کے انتخابی نتائج کے پہلے مرحلے کو دیکھتی ہوں تو میرے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی جو اخوان المسلمین کا ہی دوسرا نام ہے تقریباً 37 فی صد ووٹ لیکر سب سے اُوپر ہے، دوسرے نمبر پر اسلامی نظریات رکھنے والی پارٹی ہی النور ہے۔تو میں سمجھتی ہوں کہ مشرق وسطیٰ میں اب جو لہر اُٹھ رہی ہے یہ یقیناً یہ انقلاب آفرین ہوگی۔تیونس کے بعد مراکش میں، مصر میں اسلام پسند لوگوں کا کھڑے ہونا، افغانستان میں مُلّا عمر اور طالبان سے اُس بڑے تھانیدار کی ڈائیلاگ کی بات کرنے کی طرف مائل ہونا۔

مجھے وہ مصری کبھی نہیں بھولتا جس کی ٹیکسی میں مَیں قاہرہ جدید میں رہائش پذیر ایک مشہور آرٹسٹ بو سیما تلبہ سے ملنے جا رہی تھی۔ٹیکسی ڈرائیور بڑا اُسلجھا ہوا ،انگریزی میں رواں اور گرم وسرد چشیدہ تھا۔

مسلم دُنیا کی زبوں حالی پر باتیں کرتے کرتے میری دل گرفتگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔

دراصل یہ وقت کے Phases ہیں۔خدا دنوں کو قوموں کے درمیان پھیرتا ہے۔کبھی ہمارا وقت تھا آج اُن کا ہے۔ہمارے اطوار پسندیدہ نہیں۔لیڈر اچھے اور مخلص نہیں۔پوری مسلم دُنیا اس بحران کا شکار ہے۔ہم اپنے اپنے مفادات کے اسیر بن کر رہ گئے ہیں۔مسلم اُمّہ کہاں ہے؟

مگر اُمید رکھیے۔بہت گہری تاریکیوں میں روشنی ضرور پھوٹے گی۔تو شاید وہ وقت آنے والا ہے۔وہ روشنی پھوٹنے والی ہے گو ابھی وہ لیڈر شپ سامنے نہیں آئی جو تاریخ کا دھارا بدلنے پر قادر ہوتی ہے مگر انشاءاللہ وہ پھوٹے گی۔

13-06-2012 پاکستان

لمحہ فکریہ

جمہوریت بہترین انتقام ہے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

گذشتہ چار سالوں میں جانے کتنی بار دل میں خیال آیا کہ جس جانب ہم تیزی سے گامزن ہیں کیا چار سال قبل اِس کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا؟ کتنی بڑی کامیابی حاصل کی تھی ہم نے۔ایک ڈکٹیٹرDictator کو دو سال کے مختصر عرصے میں نکال باہر کیا۔کیا یہ کم کامیابی تھی؟بد قسمت برمی Burmi پچھلی کتنی دہائیوں سے کتنی کوششوں کتنی جانوں کے نذرانے کے باوجود ملٹری جنتا سے نجات حاصل نہیں کر سکے ہیں۔باوجود اِس کے کہ اُن کے پاس آنگ سانگ سوچی جیسی قد آور لیڈر بھی موجود ہو اور ہزاروں لوگوں نے اپنا لہو بھی بہایا ہو۔

پر کس کے گمان میں تھا کہ اِس دریا کے پار اور کتنے دریا ہم نے پار کرنے ہیں۔جھوٹ،فریب اور چوری کا وہ بازار گرم ہے کہ اللہ کی پناہ۔اب تو یہ خوف لاحق ہو گیا ہے کہ شاید ہماری قوم کی سچ پرکھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو چکی ہے۔کوئی چینل channel دیکھ لیجئے۔ہر چوری، ہر جرم کو جائز بنانے کی ایسی ایسی تاویل پیش کی جاتی ہے اور ایسی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے کہ انسان کو گھن آتی ہے۔میں سوچتی ہوں کہ ہمارے بچے جب یہ تماشا دیکھتے ہوں گے تو کیا سوچتے ہوں گے؟اگر ہر جرم ہر فریب کو یہ لوگ جائز قرار دے رہے ہیں تو ہماری نئی نسل کی تربیت تو ہو چکی۔جب ریفرنس Reference دینے کا وقت آتا ہے تو مثالیں ہم لاتے ہیں خلفائے راشدین کی اور جب کرنے کا وقت آتا ہے تو یزید سے دو قدم آگے چلے جاتے ہیں۔دُور کیوں جانا اعتزاز احسن کو ہی دیکھ لیجئے۔جب مشرف کے خلاف پیش ہوا تو استثناء کے معاملے میں حضرت عمر فاروق ؓ کی مثال پیش کی اور اب وہی اعتزاز احسن اُسی استثناء کے معاملے میں کیا دلائل دے رہا ہے۔کیا یہ رول ماڈلز Role Models ہیں ہماری نئی نسل کے لیے؟

مُلک کی حکمران جماعت کے بارے تو کیا لکھنا کیا کہنا،انھوں نے شہیدوں قبروں کی آڑ میں ہر چوری، ہر جھوٹ، ہر بے ایمانی کو حلال کرنے کا کیا شاندار وطیرہ اختیار کیا ہے۔اُن کا بس چلے تو شاید بلکہ یقیناً ہر اخلاقی قدر کی بنیادی حیثیت ہی تبدیل کر دیں۔ہنری کسنجر نے کہا تھا کہ اتنا سچ بولو کہ جھوٹ ڈھونڈنا مشکل ہو جائے۔حکمران جماعت کا موٹوMotto ہے کہ اتنا جھوٹ بولو کہ سچ اور جھوٹ کی تمیز ہی مشکل ہو جائے۔جھوٹ ہی سچ مان لیا جائے گلہ تو اُن سے ہے جو عوام کی خدمت کے بلند و بانگ دعوے کرتے نہیں تھکتے۔ابھی یہ ہماری سمجھ میں آنا باقی ہے کہ یہ حکمران ہیں یا اپوزیشن۔

باقی صوبوں کا تو جو حال ہے وہ تو سب کے سامنے ہی ہے۔یہاں گوڈ گورنس Good Governess کے نام پہ جو گُل کھلائے جا رہے ہیں ذرا اِن کا احوال ملاحظہ کر لیجئے۔

اور اب مینار پاکستان میں ایک نیا کیمپ آفس کھول کر ہماری نسلوں پہ مزید احسان کیا جا رہا ہے۔اگر آپ کو لاہور کے کسی سرکاری دفتر میں کسی گریڈ اُنیس بیس کے افسر کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے تو آپ کو بھول جائے گا کہ لوڈشیڈنگ بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔جس بے دردی سے سرکاری وسائل کی بربادی کی جاتی ہے وہ ایک الگ داستان ہے۔سوا ارب روپے کے لیپ ٹاپ Laptop بانٹنے کی جس طرح سے تشہیر کی جا رہی ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ میاں برادران نے سرکاری خزانے سے نہیں اپنے ذاتی اثاثے فروخت کر کے نوجوانوں پر مستقبل کے دروازے کھولے ہیں۔کیا زمانہ آگیا ہمارے پیسے ہم پہ خرچے اور احسان بھی جتایا۔

ہر موقعے ہر تقریر میں چھوٹے میاں صاحب ،صدر زرداری کے لتے لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔یہ چار سال میں ہر پتھر چاٹ چکے ہیں پر قربان جایئے اِن کی سادگی پر کہ جب انرجی کانفرنس ہوتی ہے تو اس میں بھی اُسی زور شور سے شامل ہو جاتے ہیں۔چار سال سے آپ ایک ٹولے کی وعدہ خلافیوں، بے ایمانیوں اور

چوریوں کی داستان قوم کو سناتے رہے۔تمام تر انرجی کانفرنسز کے نتائج سامنے ہونے کے باوجود میاں صاحب کیا سوچ کر پھر اُسی سوراخ سے اپنے آپ کو ڈسوانے چلے جاتے ہیں۔جتنا میاں صاحب کو عوام کا اب خیال آرہا ہے اگر پہلے کرتے تو بہتر نہ ہوتا۔اِن بے کار کانفرنسز میں وقت کا زیاع کرنے کی بجائے اگر کوئی ڈھنگ کی حکمت عملی اختیار کرتے تو ہم بہتر نتائج کی توقع کر سکتے تھے۔

بڑے فخر کی بات ہے کہ ہماری حکمران نما اپوزیشن نے USAID کو خیر آباد کہہ دیا۔پر کیا ہی اچھا ہوتا کہ جتنے پراجیکٹس projects اُس ایڈ Aid کے بند ہونے سے ختم ہو گئے اُن کو مقامی وسائل سے پورا کرنے کی سعی کی جاتی۔سیاسی نمبرز تو بن گئے پر عوام کو کیا ملا؟ اُن کی زندگیوں میں شاید محرومی کے اندھیرے ابھی باقی ہیں۔

زرداری صاحب نے کیا خوب ارشاد فرمایا۔"جمہوریت بہترین انتقام ہے۔"کس قدر سچائی ہے اِس فقرے میں۔اِس مُلک کی لاچار عوام ہر روز اِس جملے کی نئی حقیقتوں سے متعارف ہوتی ہے۔

پر شاید کہیں شعور و لاشعور کی گہرائیوں میں یہ جو سب کچھ ہو رہا ہے کیا ہم سب اپنی ذات کو اِس سے بری الزمہ ٹھہرا سکتے ہیں؟ شاید ہاں شاید ناں۔ہاں اس لیے کہ اِس قوم نے ایسی بے مثال جدوجہد کی عدلیہ کی آزادی کے لیے اور ڈکٹیٹرشپ Dictatorship کے خاتمے کیلئے اور ناں اِس لیے کہ ویسی ہی بے مثال جدوجہد یہ اِن ظالموں سے چھٹکارے کے لیے کیوں نہیں کرتی۔شاید ہم تھک گئے ہیں سرابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اور اِس کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر چُپ ہیں یا شاید ابھی ہمیں کچھ اور دریا بھی پار کرنے ہیں اِس سے پہلے کہ ہم شاد کام ہوں۔میں بھی سوچتی ہوں آپ بھی سوچیے۔

پاکستان 16-06-2012

لمحہ فکریہ

بس انجام تو یہی ہوتا ہے۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

اخبارات میں چھوٹی سی خبر تھی۔حاشیے میں جکڑی سنگل کالمی مصر کے سابق صدر حسنی مبارک انتقال کر گئے۔بعض میں تو وہ بھی نہیں تھی۔آج کی خبر ہے کہ آخری سانسوں پر ہیں۔چلیے دو چار دن اور لے لیں گے۔ہر ذی نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔یہ اتنی کڑوی حقیقت صوفیوں، درویشوں اور مومنوں کو ضرور یاد رہتی ہے اور اگر بھولی رہتی ہے تو جاہ و حشمت والوں کو، اقتدار کے سنگھاسنوں پر بیٹھنے والوں، پیسے کے بل بوتے پر ظلم و جبر کے طوفان اُٹھانے والوں کو کہ انہیں ایک دن خالی ہاتھ دو گز زمین میں اُترنا ہے۔

مصر اپنے تہذیبی ورثے کی بنا پر اوج کمال پر پہنچا ہوا۔صدیوں پرانے شاندار تمدن کے مایہ ناز نمائندوں کے ساتھ شہروں شہروں پھیلا جو اس کے ہر شہر کو منفرد کرتے ہیں۔فراعنہ کا دور ہو، یونانیوں، رومیوں کا زمانہ ہو، مسلمانوں کی مختلف نسلوں فاطمیوں، ترکوں اور مملوکوں کے مختلف ادوار ہوں ہر عہد نے اس کے شہروں کو کچھ نہ کچھ سوغاتیں دی ہیں۔قاہرہ دُنیا میں اگر اپنے اہراموں کی بدولت مشہور ہے تو اپنی اسلامی ثقافت کے جا بجا بکھرے رنگوں پر بھی نازاں ہے۔برٹش دور کی اپنی غلامی میں بھی اس کا قاہرہ بین الاقوامی شہر کے طور پر جانا پہچانا جاتا تھا۔

2007ء میں مصر اپنی سیاحت کے دوران میں نے غیر مُلکی سیاحوں کے پرے اس کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں گھومتے پھرتے دیکھتے اس کے بڑے شہروں میں جدید کلچر کے رنگوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بے اختیار اس پر رشک کرتے ہوئے سوچا تھا کہ یقیناً حکمران اپنے لوگوں کیلئے بہت سنجیدہ ہوں گے۔

پر اولڈ قاہرہ میں کیا داخل ہوئی عمرو بن عاص کی مسجد میں حاضری دینی تھی اور وہاں خواتین والے حصے میں بے شمار نوجوان بچیاں انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں اپنے سامنے رکھے پڑھنے میں مصروف تھیں۔کوئی میڈیکل کی سٹوڈنٹ تھی تو کوئی یونیورسٹی میں۔پہلے تو قدرے حیرانگی ہوئی کہ مسجد میں اتنی ڈھیر ساری لڑکیاں۔ذرا آگے بڑھ کر یہ منظر بھی دیکھا تھا کہ دو لڑکیاں عقبی باتھ روموں سے نہا کر نکلی تھیں اور ایک لڑکی نے کپڑے دھو کر صحن میں پھیلائے تھے۔اتنا تو خیر میں جان گئی تھی کہ عرب ممالک میں مسجدوں میں ایک چوتھائی حصہ عورتوں کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔اب وہ ان حصّوں کو کیسے استعمال کرتی ہیں یہ ان مسجدوں کے محل وقوع پر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شاپنگ پلازوں میں بنی مسجدیں اگر خواتین کیلئے جائے نماز تھیں تو وہیں ان کیلئے ریٹائرنگ روم Retiring Room بھی ہیں۔مگر اولڈ قاہرہ جیسے غریب علاقوں میں جیسا کہ میں دیکھتی اور سُنتی تھی یہ بچیوں کی مطالعہ گاہ تھی۔یہاں پڑھنے کی وجہ ان کے چھوٹے چھوٹے گھر تھے جن کے صحن نہیں تھے اور اگر تھے تو بہت چھوٹے۔

میں نے لڑکیوں کے پاس بیٹھ کر اُن سے باتیں شروع کیں۔حسنی مبارک کا ذکر آیا لڑکیوں کے لہجے میں نفرت کا اظہار تھا۔

امریکہ کا پٹھو ہے۔بہت شاہانہ طرز زندگی ہے جو مصر جیسے مُلک کے حکمران کو زیب نہیں دیتا۔دُنیا جدید قاہرہ کو دیکھ کر سمجھتی ہے کہ مصر بہت ترقی یافتہ اور خوشحال مُلک ہے۔اولڈ قاہرہ کی گلیوں میں کوئی دیکھے تو اُسے پتہ چلے گا کہ مصری کتنے تنگ دست ہیں اور واقعی وہ سچ کہتی تھیں۔میں نے ایک ایک کمرے میں ایک ایک خاندان کو رہتے دیکھا۔ایک بیڈ پر دوسرا تیسرا بیڈ دھرا ہوا۔کہیں فرش پر دریاں چادریں بچھی ہوئیں۔تنگ و تاریک گلیاں۔

مُلک میں یک جماعتی نظام جس نے قوم کو سیاسی طور پر مفلوج کر رکھا تھا۔بلکہ محلے کے نوجوان سے جب بات ہوئی اُس نے تلخی سے کہا وہ اپنے بیٹے کو تیار کر رہا ہے ہماری جان کہاں اِن سے چھُٹنی ہے۔ایسے ہی ایک اور گھر میں جا گھسے۔اس گھر کے سربراہ نے دُکھ اور تاسف سے کہا۔ہمارے اِن لیڈروں نے اسرائیل کا

مقابلہ کرنا ہے۔کوئی اسرائیل جا کر دیکھے کتنی منظم قوم ہے ۔اپنے لوگوں کی کتنی خیر خواہ ہے۔اُن کیلئے کیا کیا سہولتیں فراہم کر رہی ہے۔اُس کے لیڈر کتنے سادہ کتنے ایماندار اور اصول پرست ہیں۔ان کی عیاشیاں دیکھیں۔اُن دنوں ابھی لیبیا کا معمر قذافی اپنے انجام کو نہیں پہنچا تھا۔کبھی ان کی سربراہی کانفرنسیں دیکھیں۔شرم آتی ہے انہیں دیکھ کر۔سب کے سب غاصب اور استعماری طاقتوں کے نمائندے۔

ملحقہ محلّے کے ایک نوجوان محمد وس نے جمال مبارک اور اعلیٰ Alaa مبارک حسنی مبارک کے دونوں بیٹوں کی دھاندلیوں کی وہ وہ داستانیں سُنائیں کہ کنگ ہو کر رہ گئی۔باپ کے عہدے اور طاقت کا استعمال۔340 ملین پاؤنڈ سوئز بینکوں میں۔جمال کی گدی نشین بننے کی کوششیں اور نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی National Democratic Party میں گھسنے اور جگہ بنانے کی کاوشیں۔

پاکستان کی طرح مصر میں بھی فوج بڑی طاقتور ہے۔میرے سوال پر محمد وس کے چھوٹے بھائی شعید نے طنزیہ کہا۔حسنی مبارک کس کی شہہ پر کھڑا ہے۔فوج پُشت پر ہے۔عرب دُنیا کی بہترین فوج مصری جسے چند گھنٹوں میں اسرائیل نے چھٹی لگا دی۔بھئی جب ایرفورس کے پائلٹ ساری رات بیلا ڈانس دیکھیں گے اور صُبح جھومتے ہوئے ناشتہ کر رہے ہوں گے تو پھر آپ کی فضائیہ تو گھنٹوں کی مار ہے۔اسکندریہ بیس پر یہی کچھ ہوا تھا۔عرب دُنیا کو کسی طاقتور انقلاب کی ضرورت ہے جو کرپشن سے بھرے ہوئے اس نظام کی جڑیں ہلا دے۔

اخوان المسلمین کے بارے میں بات ہوئی۔شعید نے جواباً کہا!مخلص ہیں مگر انہیں اپنی انتہا پسندی کو اعتدال میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ان کا ایک انقلابی نعرہ غیر مُلکی سیاحوں پر جس طرح اثر انداز ہو کر غریب آدمی کے چولہے کو ٹھنڈا کرنے کا باعث بنتا ہے وہ غور طلب ہے۔سیاحت مصر کا تیسرا بڑا ذریعہ آمدنی ہے۔

سچ تو یہ ہے تیسری دُنیا کے مُلکوں کے لیڈروں اور حکمرانوں کو انقلابی بننے کی ضرورت ہے۔پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔کیسے کیسے بھیانک انکشافات سامنے آرہے ہیں۔کرپشن کی کتنی داستانیں عریاں ہو رہی ہیں۔جیسے لوٹ مچی ہو "سمیٹ لو سب" اُن کا مطمع نظر ہے۔

پر انجام۔یہی انسان کو جگہ تو دو گز چاہیے اور یہ بدن جس کیلئے گناہوں کے بوجھ اُٹھائے جاتے ہیں مٹی میں مل جانا ہے۔

پر اگر یہ سمجھ آجائے تو رونا کس بات کا۔

پاکستان 23-06-2012

لمحہ فکریہ

سوویت سے آزاد ہونے والا ازبکستان کیسا ہے؟

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

سالوں پہلے ایک پاکستانی ڈاکٹر سے بیاہ کرنے والی ایک ازبک لڑکی نے مجھ سے کہا تھا۔لوگ سوویت سے الگ ہو کر خوش نہیں ہیں۔انہیں بہت مسائل کا سامنا ہے۔حیرت کی بات تھی۔اکیس سال بعد 26 جون کی سہ پہر سیما پیروز،شہناز مزمل،مہر النساء اور میں تاشقند کے ہوائی اڈے پر اُترے تو میرے ذہن میں کلبلاتے بہت سے سوال تھے۔تاشقند کو دیکھ کر احساس ہوا کہ آپ یوروپ کے کسی شہر میں ہیں۔صفائی ستھرائی،خوبصورت سڑکیں پھولوں پیڑوں سے سجی اطراف بلند و بالا عمارتوں سے گھری ایک دلکش تاثر کو جنم دیتی تھیں۔سوویت کے زمانے کی بنی ہوئی عمارتوں پر اگر کہیں کہنہ سالی کے تاثرات کی جھلک ہے تو بھی ان کی ظاہری صورت کو اچھا بنانے کی کوشش ضرور نظر آتی ہے۔

شام کو مستقلک Mustakillik (آزادی چوک) میں یادگاریں دکھانے والی گائیڈ آرینا نے جو بمشکل 22,23 کی ہوگی ہمیں اُزگلک Ezguli محرابوں سے سجے راستے سے گزارتی اُن یادگاروں کے پاس لے آئی تھی جو محبتوں اور جذبوں کی نمائندہ تھیں۔یہ محرابیں نئے مُلک کیلئے بلند اور بہترین آرزوؤں کی نمائندہ سمبل symbol تھیں جن پر سجا بگلے کا مجسمہ اڑان لے رہا ہے۔گرینائٹ کے چبوترے پر کھڑا اپنی ماں Happy mother کا مجسمہ گود میں بچے کو لیے ہوئے ہے۔ہیپی مدر Happy mother ازبک دھرتی کا سمبل symbol اور گود میں بچہ اُس کی نئی نسل کا مستقبل۔

لڑکی کی آواز میں اپنی آزادی کے لفظ سے جس خوشی کا اظہار تھا وہ ہمیں بہت کچھ بتا اور سمجھا رہا تھا۔قریب ہی Sad mother کا مجسمہ تھا۔پرانے وقتوں کی ازبک ماں جس کے جوان بچے دوسری جنگ عظیم میں بھینٹ چڑھے۔

یہ جنگ ہماری دھرتی کیلئے نہیں تھی۔یہ سوویت کیلئے تھی۔اُس کی عظمت اور اُس کی کامرانیوں کیلئے کہ ہم غلام تھے۔

نوجوان لڑکی کے لہجے میں ایک آزاد مُلک کی شہری ہونے کا جو ناز اور اعتماد تھا وہ یقیناً نئے رجحان کا نمائندہ تھا۔

چرواک کیلئے جو گاڑی لی اُس کا ٹیکسی ڈرائیور بھی انگریزی سے شناسا تھا۔پہلا سوال تو یہی ہوا کہ کیا محسوس ہوتا ہے۔

آغاز مشکل تھا کہ تنخواہیں لگی بندھی اور سہولیات کے بہت عادی تھے۔گھبراہٹ اور افراتفری تھی مگر اب سنبھل گئے ہیں۔خوش ہیں۔چھوٹے بڑے ذاتی کاروباروں کا بھی آغاز ہے۔ہمارے ہاں امیر اور درمیانہ طبقہ ہے۔غریب یہاں نہیں۔وہ ٹھیک کہتا تھا کہ ہفتہ بھر قیام کے دوران ہمیں تو سوائے ایک جگہ ایک عورت کے کوئی منگتا نظر نہیں آیا۔

تاشقند کا تاثر ایک دیدہ زیب مغربی شہر کے طور پر سامنے آیا تھا مگر سمرقند اور بخارا دونوں جدیدیت کے ساتھ اپنے قدیمی تہذیبی رنگوں میں بھی گندھے ہوئے ہیں۔سوویت کے زمانوں میں دونوں شہروں کے صاحب ثروت آدمیوں نے اپنے محل نما گھر او حویلیاں خاندانوں سے بھری تھیں کہ کہیں یہ حکومت کی آنکھوں میں نہ آجائیں اور ضبط ہو جائیں۔1991ء میں جونہی آزادی ملی ان گھروں کے پرانے رنگوں میں نئے رنگوں کی آمیزش سے ہوٹل بنا دیئے گئے۔دومنزلہ بالکونیاں ،ان کی چوبی ریلنگ، ان کے اندرونی باغیچوں میں پھلدار درختوں کی بہتات اور دیواروں پر سولہویں سترہویں صدی کے سمرقند و بخارا کی معاشرتی زندگی کی جھلکیاں مصوروں کے نوک برش کے کمالات کی صورت آویزاں تھیں کہ جنہیں پہروں دیکھو اور جی نہ بھرے والی بات تھی۔

لوگوں کا پہناوا مغربی ہے۔بڑی بوڑھیاں دیہاتوں میں اپنے قدیمی رنگ میں نظر آتی ہیں۔سمرقند اور بخارا دونوں جگہ لباس کے معاملے میں نوجوان لڑکے

لڑکیاں اور عورتیں کم وبیش ایک جیسے ہی ہیں ۔ اُونچا سکرٹ اور ٹوپ کہیں ۔لمبے فراک مگر لوگوں کے چہروں پر معصومیت اور محبت کے رنگ بکھرے ہوئے ۔ ٹمٹمتے سے آغاز کرنے والی لڑکیوں ،عورتوں اور مردوں کو جونہی پتہ چلتا کہ ہم پاکستان سے ہیں اور مسلمان ہیں تو بے اختیار ان کی زبانوں پر "الحمداللہ" کے الفاظ تھرکتے ۔میٹھی سی مسکراہٹ آنکھوں اور چہروں پر پھیلتی جو یہ بتاتی کہ ان کے جذبے ماند نہیں پڑے ۔

مُلک میں کوابھی جمہوریت اُس انداز میں نہیں ہے ۔ایک طرح ڈکٹیٹرشپ Dictatorship ہی ہے ۔اسلام کیری مووKarimov آزادی سے لے کر ابھی تک مسندِ اقتدار پر براجمان ہیں ۔لوگوں کا خیال تھا کہ آزاد ہوں گے ۔سیاسی جماعتیں تشکیل پائیں گی اور وہ اس عمل کا حصّہ بنیں گے مگر ابھی اس میں وقت لگے گا ۔آخری الیکشن میں تو بڑی لے دے بھی ہوئی کہ ہیرا پھیری اپنی آخری حدوں کو چھوگئی مگر سب آوازوں کو دبا دیا گیا ۔چند لوگوں نے اِن خیالات کا اظہار کیا کہ بنیادی ضروریات کی فراہمی بہت اچھے طریقے سے ہورہی ہے ۔"ہمیں اِن بکھیڑوں میں نہیں پڑنا ۔"

بخارا اور سمرقند کے چند نوجوان مرد اور عورتیں جو انگریزی سمجھتے تھے اور بطور گائیڈ کام کرتے ہیں کے ہاں اِن جذبات کا اظہار تھا ۔

سوویت کا بہر حال یہ احسان تو ہمیں یاد رکھنا ہے کہ انہوں نے ہمیں تعلیم دی ۔آج ہمارے مُلک کی شرح خواندگی 100% ہے ۔ہم ایک نظم وضبط والی قوم ہیں ۔قانون کی پیروی اور اس کے احترام کو اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔

نقصان بھی بہر حال ہوا کہ وہ تہذیبی آثاثہ جس کیلئے سمرقند و بخارا دُنیا بھر میں نمایاں تھا ختم ہوگیا ۔

رسم الخط کی تبدیلی نے ہمیں اُس ورثے سے دُور کردیا جس پر ہمارے اجداد کو ناز تھا ۔تاشقند میوزیم میں ہمارے گائیڈ سعید کی آنکھیں نم سی تھیں ۔یہاں تو نقلیں رہ گئی ہیں ۔اصل چیزیں تو روسی لُوٹ کرلے گئے ۔اُن کے میوزیم نایاب اور نادر اشیاء سے سج گئے ۔

انہی دنوں پاکستان سے سیالکوٹ اور لاہور کے کاروباری لوگوں کا ایک گروپ وہاں منعقد ہونے والی ایک نمائش کیلئے پہنچا تھا ۔ازبکستان ہوٹل میں ٹھہرا تھا ۔ہمارے پوچھنے پر بتایا گیا کہ بیوٹی پارلرز سے متعلق سامان لائے ہیں ۔سامان تو بِک گیا مگر مزید آرڈر order نہیں ملے ۔بہر حال ہم نا اُمید نہیں ۔انشاء اللہ یہاں جگہ بنائیں گے ۔

تاشقند کی ایک وجہ شہرت ہندوستان پاکستان کے نوجوان لڑکوں کیلئے کشش کا باعث مقامی نوجوان خوبصورت لڑکیاں ہیں جو آسانی سے دستیاب ہیں ۔ہندوستان کے لوگوں نے بہت گھٹیاپن کا مظاہرہ کیا کہ یوٹیوب You-tube پر عریاں تصاویر لگا کر سرخیاں لگائیں !

"تاشقند! طوائفیت کا گڑھ ۔"

حکومت کے نوٹس میں یہ بات آئی تو فوراً ایکشن لیا گیا ۔ہندوستانیوں کے ویزے پر پابندی لگادی گئی اور دوسرے یہ قانون پاس ہوا کہ کوئی غیر مُلکی کسی مقامی لڑکی کو لے کر ہوٹل کے کمرے میں نہیں جاسکتا ۔

کوئی ماہ پہلے ہندوستان کی درخواست اور یقین دہانی پر اس پابندی کو نرم کیا گیا ۔

مذہب کی طرف رجحان اُمید افزا ہے ۔نئی مسجدیں بن رہی ہیں اور نمازیوں کی اکثریت نوجوانوں کی ہے ۔

پاکستان کے سفیر جناب محمد وحید الحسن سے بھی ایک نشست رہی ۔ہمارے جانے سے پہلے وہ پاکستانی بزنس مینوں کے ساتھ مصروف تھے ۔خاصے سرگرم اور پاکستانی کیمونٹی Pakistani Community کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں ۔کُھلے ڈُلے آدمی ہیں ۔ہز ہائی نس کے کلف سے اکڑے ہوئے نہیں لگتے ہیں ۔

پاکستان 06-07-2012

لمحہ فکریہ

برمی مسلمان اور بنگلہ دیش

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

ٹی وی T.V پر چلتے مناظر، جلتے گھر، سسکتی بلکتی عورتیں، بچے، مرد، بوڑھے خون میں نہاتے انسان آہیں اور آنسو۔ اللہ ہر آفت نے مسلمانوں پر ٹوٹنا ہے۔ ہر مصیبت نے ان کے گھروں کو تاڑنا ہے اور برق نے ان کے آشیانوں کو ہی جلانا ہے۔ کلیجہ جیسے کسی نے مٹھی میں پکڑ کر بھینچ ڈالا تھا۔ سالوں پہلے کی باتیں جب بنگلہ دیش پاکستان تھا اُن دنوں کی یادیں کونے کھدروں سے نکل کر باہر آ گئی تھیں۔ بُلبل اکیڈیمی میں ڈرامہ فیسٹیول Drama Festival چل رہا تھا۔ ہم ڈھاکہ یونیورسٹی کی چند طالبات اِس ڈرامے کو دیکھنے آئی تھیں۔ ڈرامہ اوپن Open میں تھا اور ہم لوگ گھاس پر بیٹھے تھے۔ پدما کے سیلاب اور اس کی تباہ کاریوں کی داستان، جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف یہ ایک کامیاب ڈرامہ تھا۔ دفعتاً میں نے اپنے دائیں ہاتھ دیکھا۔ دُبلی پتلی سی ایک لڑکی میری طرف متوجہ تھی اور مجھ سے تعارف چاہ رہی تھی۔ میں نے اپنے متعلق بتایا اور اس کے بارے میں جانا۔ وہ مزمل تھی۔ روانگ کی روہنگیائی نسل سے تھی۔ برما سے لُٹ پُٹ کر ڈھاکہ آئی تھی۔ بُلبل اکیڈیمی میں چھوٹے موٹے کام کرتی تھی اور بمشکل اپنا اور اپنی پڑھائی کا خرچ اُٹھاتی تھی۔ والدین منشی گنج کے پاس جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ اس کی اُداس آنکھوں اور ہونٹوں پر جو سوال تھے مجھے انہوں نے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے بتائیں وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ مسلمان کا وطنیت کا تصور اتنا گھٹیا اور محدود کیوں ہو گیا ہے۔ مایو میرا دیس تھا میرا وطن تھا۔ میرے دادا پردادا کی ہڈیاں وہیں بنیں اور وہیں گلی سڑیں۔ لیکن برما کی اشتراکی حکومت کی سختیوں نے ہمیں دیس بدر ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہم نے تو سوچا تھا ہم دُنیا کی سب سے بڑی مملکت کے دامن میں پناہ گزین ہو گئے ہیں اور عافیت میں آ گئے ہیں پر یہ ہماری بھول تھی۔ یہاں آ کر ہمیں احساس ہوا ہے ہم نے غلط جگہ چُنی۔ تم بتاؤ ہم کہاں جائیں۔ مسلمان کیلئے کونسی جگہ رہ گئی ہے؟

میں ٹُک ٹُک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچے چلی جا رہی تھی کہ میں اس کے سوال کا کیا جواب دوں۔ اس وقت میں یہ کب جانتی تھی کہ یہ قیامت اُس کے وطن میں اُس کے ہم مذہب بھائیوں پر بار بار آنی ہے۔ چالیس بتالیس سال کے عرصے میں کئی بار ایسا ہوا کہ اُن پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ دھڑ دھڑ بہتے آنسوؤں میں کس سے یہ سوال کیا جائے کہ آخر مسلمانوں کیلئے کہاں گوشہ عافیت ہے؟ اُس کا خون اِتنا سستا اور وہ اتنا بے آبرو کیوں ہو گیا ہے؟ بوسنیا میں اُن کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ چیچنیا میں جس طرح اُن کی املاک جلائی گئیں۔ بموں اور بارود سے اُن کا خوبصورت علاقہ تباہ کر دیا گیا اور جس طرح پانی کی طرح ان کا خون بہایا گیا۔ کشمیر، افغانستان، فلسطین، عراق کون سی جگہ ہے جہاں وہ زیرِ عتاب نہیں۔ جہاں اُن پر عرصہ حیات تنگ نہیں۔ برما میں یہ تشدد اور خون ریزی اب نہیں پرانی ہے۔ برما میں بوزی قبائل کا ماگ گروپ دہشت گردی کے حوالے سے انتہائی سفاک ہے۔ دہشت گردوں کے اِن ٹولوں نے ہزاروں شہریوں کو جس طرح اُن پر تشدد کر کے انہیں نقل مکانی پر مجبور کیا تو وہ کہاں جائیں؟

تھائی لینڈ، چین اور بھوٹان سے ملنے والی سرحدوں میں اگر انہیں کہیں عافیت نظر آتی ہے تو وہ چٹاگانگ سے ملنے والا راستہ ہے جس میں لیبی مسلم ریاست ہے۔ اپنے جلتے گھر بار چھوڑ کر جب وہ لوگ بھاگے تو بنگلہ دیش کی فوج اور بحریہ نے رکاوٹیں کھڑی کیں اور واپس برما کی طرف دھکیلا جہاں وہ قتل ہوئے۔ شاید بنگلہ دیش ماضی میں اِس نقل مکانی کے سلسلے میں مصائب کا شکار رہا ہو کیونکہ اس کے قائم کردہ کیمپوں میں حالات بہت ابتر تھے۔ شاید لاکھوں شہریوں کا بوجھ برداشت کرنا اُس کیلئے مشکل تھا۔ ہاں البتہ تھائی لینڈ میں بھی کچھ گروہ بھاگ کر داخل ہوئے۔

وجہ تنازعہ کیا تھی۔ بدھ لڑکی کے قبول اسلام کا قصہ ہے یا ویسے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ایک سازش۔ مذہب ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ کوئی اِسے قبول کرے یا

رڈ۔ یہ امر جھگڑے کی بنیاد کس لیے ۔ یہاں آنگ سانگ سوچی جیسی لبرل سوچ رکھنے والی لیڈر leader بھی بے بس نظر آتی ہے ۔ بدھوں کے بارے میں ایک بات زبان زدِ عام ہے کہ یہ انتہائی امن پسند قوم ہے مگر اس امن پسند قوم کا حال دیکھیے ۔ مسلمانوں کو یہاں شہریت نہیں دی جا رہی ۔ ان کے تعلیم حاصل کرنے پر پابندیاں، ملازمتوں کا حصول مشکل اور برما کو اُن سے خالی کرنے کی کوششیں ۔

اقوامِ متحدہ کہاں ہے؟ اب اس کی خاموشی سمجھ میں نہیں آتی ۔ مشرقی تیمور پر اُس نے جس طرح ایکشن action لیا کیا برما کے حالات ویسا ایکشن action لینے کے متقضی نہیں ۔ مگر یہاں مسلمان ہیں ۔ مشرقی تیمور کے عیسائی نہیں اور مسلمانوں کو ختم کرو ، ان کی نسل کشی کرو ۔ حکومتوں کی نگرانی میں یہ سب ہو رہا ہے اور دُکھ کی بات کسی مسلمان مُلک کے کانوں پر جوں نہیں رینگی ۔ کسی نے آواز نہیں اُٹھائی ۔

خدایا رحم ۔ خونِ مسلم کی اتنی ارزانی ۔

پاکستان 25-07-2012

لمحہ فکریہ

پرانی نسل، پاکستان اور ڈیوڈ بن گورین (Ben Gurion) کی تقریر۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

پاکستان کا یوم آزادی 14 اگست اور اسرائیل کا 14 مئی ۔سن میں ایک سال کا فرق ۔پاکستان 1947ء میں بنا اور اسرائیلنے 1948ء میں اپنی مملکت کا علان کیا۔ہولوکاسٹ اور یہودی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ زندہ قومیں کس طرح اپنے بچوں کو اپنی تاریخ سے آگاہ رکھتی ہیں ۔جہاں جہاں یہودی کیمونٹی Community ہے وہاں ہولوکاسٹ میوزیم ہے اور اسرائیلی بچوں کا اُس میوزیم میں سال میں دو تین مرتبہ جانا، اُسے دیکھنا اور اس کی تاریخ سے آگاہ ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا یہودی لڑکے اور لڑکی کیلئے Bar Mitzvah اور Bat Mitzvah ضروری ہے۔

میں نے خود سے سوال کیا تھا۔کیا میرے وطن کے شہروں میں کوئی ایسے مرکز ہیں جہاں پاکستان کی تاریخ محفوظ کی گئی ہو اور بچے وہاں جاتے ہوں۔ظاہر ہے جواب تو نفی میں ہی ہونا تھا۔

میں نے پھر خود سے سوال کیا تھا۔کیا پاکستان بنانے ،اس میں حصہ لینے اور اس کا حصہ بننے والی پرانی نسل نے اپنے بچوں میں اس حوالے سے کچھ منتقل کیا کہ پاکستان کیسے بنا؟ اس کے لیے کیا کچھ کرنا پڑا؟ زمانوں سے ایک خطہ زمین پر رہنے والوں کیلئے اپنی اُس جگہ سے ناطہ توڑ کر کسی دوسری جگہ جانے کو انہوں نے کیسے قبول کیا۔کیمپوں میں موسم کی شدت، برستی بارشیں، بیماریاں، بھوک پیاس، بے گھری کا دُکھ یہ سب چیزیں انہوں نے کیسے برداشت کیں ۔عزیز رشتہ دار جو بچھڑ گئے ، جو آنکھوں کے سامنے شہید کر دیئے گئے ، جو گھروں میں جل گئے ۔بیٹیاں بہنیں جنہوں نے عصمت بچانے کیلئے کنوئیں میں چھلانگیں لگا دیں ۔وہ نسل جس نے یہ مرحلے دیکھے، سہے اور جو اپنے شعور کی تمام تر حسیات کے ساتھ ہجرت کے اِس تجربے سے گزریں اُس نے اِس کی رُوح کو سمجھا؟ ''نہیں'' میرا جواب تھا۔ہاں جن کے افرادِ خانہ میں سے کوئی شہید ہوا یا ہوئے انہوں نے اس حوالے سے اس سانحہ کو یاد رکھا۔میں نے اپنا تجزیہ کیا۔

میرا خاندان جالندھر کا مہاجر تھا۔میری عمر دو ڈھائی سال ہوگی۔آج میں اگر یاد کروں کہ میرے خاندان نے کب کب مجھے پاکستان کے بارے میں کچھ بتایا۔میری ذہنی تربیت میں اِس اتنے بڑے واقعہ کو ذہن نشین کروانے میں اُن کا کیا کردار تھا۔جواب پھر نفی میں ہوگا۔واضح ہو کہ میرے خاندان کے اُس وقت کے مرد پڑھے لکھے تھے اور خواتین بھی اگر اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تو ان پڑھ بھی نہ تھیں ۔میری خالائیں اپنے بھائیوں کے ساتھ ان کی ملازمتوں پر ہندوستان بھر کا چکر لگاتیں ۔کہیں جھانسی ،کہیں کانپور، کہیں کلکتہ، کہیں نینی تال، کہیں شملہ۔ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جو انہوں نے چھوڑا۔حتیٰ کہ میرے والد تقسیم کے وقت میرے ماموں کے بزنس پارٹنر جو کہ ہندو تھا کے پاس کانپور میں رہ گئے تھے ۔وہ کہیں بعد میں آئے۔

اپنی یادداشتوں کی گٹھڑی کو ٹٹولوں تو میں کہہ سکتی ہوں میری ذہنی تربیت میں کہیں وہ عنصر نہیں تھا۔میں نے یہ بات اکثر گھر میں سُنی کہ میری دادی زمانوں اسی انتظار میں بیٹھی رہیں کہ کب حالات ٹھیک ہوں اور وہ واپس جائیں ۔آتے ہوئے انہوں نے اپنے گھر کو تالے ضرور لگائے پر چابیاں جیب میں ڈالیں ۔میرے فوجی چچا نے جو انہیں ٹرک لے کر لینے آئے تھے نے چابیاں پھینک دینے کو کہا تو بولیں ۔پھوٹ کوئی سدا وہیں رہنا ہے چار دن بعد آجائیں گے۔

میرے گھر میں عرصے تک پاکستان کے شہروں کا ہندوستان کے شہروں سے مقابلہ ہوتا رہا۔دیس کے گنّے ،دیس کی مولیاں، دیس کی کپاس، دیس کی گلیاں یہ ذہن سے نہ نکلی تھیں ۔ہاں کیمپوں کی صعوبتوں کا ضرور رونا رویا جاتا۔

میں سمجھتی ہوں یہ عمومی رویے کم وبیش سبھی گھروں کے تھے ۔اب ذرا انہیں چھوڑ کر سیاسی لیڈروں کے رویّوں کا جائزہ لیں کہ انہیں پاکستان سے کتنی محبت تھی۔

میں سمجھتی ہوں پاکستان بننے تک کا جو جوش و خروش ہمیں پاکستان بننے سے پہلے لیڈروں اور کارکنوں میں نظر آتا ہے وہ پاکستان بننے کے بعد بتدریج ختم ہوتا گیا۔ گو کہ قائداعظمؒ کے بعد ایوب خان تک پاکستان کے تمام سرکردہ لیڈر مالی معاملات میں نہایت شفاف تھے حتیٰ کہ سکندر مرزا جیسے بھی۔ لیکن کیا اُن کا دامن اقتدار کی ہوس سے پاک تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ لیاقت علی خان نے بھی اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے الیکشن میں تاخیر کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1973ء تک کوئی آئین ہی نہ بن سکا اور نہ قوم کو پاکستانی بنانے کی طرف کوئی توجہ دی گئی۔ نتیجہ پاکستان کے دولخت ہونے کی صورت میں تھا۔ جہاں تک اس خطے میں مسلمانیت کے تصور کی مضبوطی کا تعلق ہے وہ تھی خواہ وہ رجعت پسندی کی صورت میں تھی یا کہیں ماڈرن صورت میں لیکن اِن مختلف نسلوں، لسانی فرقوں اور مذہبی گروہوں کو مضبوط قومیت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری تھا جو بدقسمتی سے ہمارے لیڈروں کی کسی ترجیح میں نہ تھا۔

میرے خیال میں اپنے اقتدار پر جمے رہنے اور اُسے طول دینے کیلئے ضروری تھا کہ قوم مختلف دھڑوں میں بٹی رہے مختلف فرقوں میں منقسم رہے۔ تعلیمی میدان میں جاہل رہے۔ وڈیروں جاگیرداروں کے چنگل میں پھنسی رہے تاکہ نہ شعور ہو اور نہ احتجاج ہو حالانکہ انڈیا نے آزادی کے فوراً بعد زمینداری اور جاگیرداری نظام ختم کردیا تھا۔ ہمارے سامنے یہ مثال تھی۔ محمد علی جناح سے ایک دفعہ کراچی میں ان کے ایک پارسی دوست نے اسی مسئلے پر جب بات کی تو انہوں نے کہا تھا۔ پاکستانیوں کو پاکستانی بننے میں سو سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ یقیناً ان کو اس سطحی درجے کی لیڈرشپ کا اندازہ تھا جو ان کے بعد اِس مُلک کی باگ دوڑ سنبھالنے والی تھی اور اب یہ سب ہمارے سامنے ہے کہ اس کا معیار دن بدن پستی کی طرف مائل رہا۔ اور آج حال یہ ہے ہم مکمل طور پر ایک شکستہ حال Fracture سوسائٹی بن چکے ہیں جس کی سیاسی اور ملٹری لیڈرشپ Military Leadership نہایت سطحی، مفاد پرست اور کوتاہ اندیش ہے۔

آیئے تصویر کا ایک دوسرا رُخ دیکھیں۔

اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گورین (Ben Gurion) نے اس حقیقت کا اعتراف 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے فوراً بعد کیا۔ انہوں نے پیرس (فرانس) کی ساربون یونیورسٹی میں ممتاز یہودیوں کے ایک اجتماع سے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ پاکستان درحقیقت ہمارا اصلی اور حقیقی آئیڈیالوجیکل (نظریاتی) جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی و فکری سرمایہ اور جنگی و عسکری قوت و کیفیت آگے چل کر کسی بھی وقت ہمارے لئے باعث مصیبت بن سکتی ہے ہمیں اچھی طرح سوچ لینا چاہئے۔ بھارت سے دوستی ہمارے لئے نہ صرف ضروری ہے بلکہ مفید بھی ہے۔ ہمیں اس تاریخی عناد سے لازماً فائدہ اُٹھانا چاہئے جو ہندو پاکستان اور اس میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا

ہے۔ یہ تاریخی دشمنی ہمارے لئے زبردست سرمایہ ہے۔ لیکن ہماری حکمت عملی (Strategy) ایسی ہونی چاہئے کہ ہم بین الاقوامی دائروں کے ذریعہ ہی بھارت کے ساتھ اپنا ربط و ضبط رکھیں۔'' (یروشلم پوسٹ 9۔ اگست 1967ء)

یہی بات ایک دوسرے پیرائے میں امریکی کونسل فار انٹرنیشنل ریلیشنز (American Council For International Relations) کے زیراہتمام چھپنے والی ایک کتاب

(Middle East: Politics and Military Dimensions) میں کہی گئی ہے جس میں اس نظریئے کا پاکستان کی مسلح افواج اور سول ایڈمنسٹریشن Civil Administration کے کردار کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے:

''پاکستان کی مسلح افواج نظریہ پاکستان، اس کے اتحاد و سالمیت اور استحکام کی ضامن بنی ہوئی ہیں۔ جبکہ مُلک کی سول ایڈمنسٹریشن بالکل مغرب زدہ ہے اور نظریہ پاکستان پر یقین نہیں رکھتی۔''

اسی کتاب کا مصنف عالمی شہرت یافتہ یہودی پروفیسر جی پروئیز ہے جس نے بڑی کاوش سے واقعات اور مستند حوالوں کو یکجا کیا تاکہ یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک کے کارکن (International Zionists) ٹھیک ٹھیک نشانے لگا سکیں۔

نظریہ پاکستان چونکہ سیاسی و اقتصادی زندگی اور بین الاقوامی تعلقات کو اسلام کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور دُنیا بھر کے مسلمانوں کو وحدت کے دھاگے میں پروتا اور ان کی داخلی و خارجی پالیسیوں کو اس کے مطابق تعمیر کرتا ہے اس لئے یہ اسرائیل کے لئے باعث رنج و غم بنا ہوا تھا۔

اب ہم آئینے میں دیکھیں تو کیا صورت نظر آئے گی؟ میرے خیال میں مجھے اب
دکھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو آپ دیکھتے ہی ہیں۔
اور یہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی ہے۔

پاکستان 15-08-2012

لمحہ فکریہ

یہ تو میرے مخالفوں کی سازش ہے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

بہت دنوں سے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں شمالی وزیرستان میں آپریشن پر کافی بحث مباحثہ ہو رہا ہے۔ پر اگر تھوڑی گہرائی میں جا کر صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو ہم جیسے عام شہری کے لیے یہ سمجھنا بڑا مشکل ہے کہ اگر یہ آپریشن Operation ہو بھی جائے تو پھر بھی کیا فرق پڑے گا۔ پچھلے چار پانچ سالوں میں ہم نے باجوڑ، جنوبی وزیرستان میں آپریشنز سے کیا حاصل کر لیا۔ کیا باجوڑ، جنوبی وزیرستان میں حکومتی رٹ مکمل طور قائم ہو گئی۔ کیا ملک میں دہشت گردی کی وارداتوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اِن تمام آپریشنز کے باوجود دہشت گردوں نے جب اور جہاں چاہا حملہ کیا۔ ظاہراً تو یہ تمام حملے نہایت منظم اور کوآرڈینیشن Co-ordination کے ساتھ کیے گئے۔ آپریشن ہونے یا نہ ہونے سے قطع نظر میرا خیال ہے کہ ہم ایک نہایت بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اِن تمام تر دہشت گرد حملوں سے ایک بات بخوبی واضح ہے ان دہشت گردوں کو ہر موقع پر لوکل سپورٹ Local Sport حاصل تھی۔ جس نے اِن کو اِس قابل کیا وہ یہ حملے کر سکیں۔ اگر تو ایسا ہوتا کہ دہشت گرد شمالی یا جنوبی وزیرستان میں بیٹھے میزائل پھینک رہے ہوتے تو یقیناً آپریشنز Operations ہی مسائل کا حل تھے پر ایسا نہیں ہے۔ یہ تو ایک کینسر کی طرح ہمارے تمام مُلک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اِن حملوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جہاں ایجنسیاں مکمل طور سے اِن دہشت گردوں کے قبضے میں ہیں اِن کا مُلک کے اندر بھی خاصا مضبوط اور مربوط operational نیٹ ورک ہے۔

شمالی وزیرستان میں آپریشن سے ہچکچاہٹ کی ایک اور وجہ جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ اِس آپریشن کے نتیجے میں دہشت گرد شہریوں یا تنصیبات کو نشانہ بنائیں گے اور عوام کے جان و مال کا نقصان ہو گا۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ زیادہ بہتر نہ ہو گا کہ بجائے اِس کی ہم ایجنسیوں میں آپریشنز کریں ہم اندرونی طور پر اُس نیٹ ورک Network کو توڑیں جو دہشت گردی کی وارداتوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک یہ نیٹ ورک قائم ہے چاہے جتنے مرضی آپریشنز کر لیے جائیں نتیجہ وہی رہے گا جو اِس سے پہلے کیے گئے آپریشنز کا رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب قوم کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارا اصل دشمن کون ہے۔ پچھلے 65 سالوں میں جتنے بھی ہمارے حقیقی یا تصوراتی دشمن ہیں اُن میں سے کسی نے ہم کو اِس قدر نقصان نہیں پہنچایا جس قدر ہمارے گھر کے اپنے چراغوں نے ہمارا بیڑہ غرق کیا ہے۔ 14 اگست کو جنرل کیانی نے بھی اپنی تقریر میں اِس جانب اِشارہ کیا۔ پر سوال یہ ہے کہ کیا صرف تقریریں مسئلے کا حل ہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا Concete قدم جس سے یہ واضح ہو کہ ہماری دورُخی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی ہے سامنے آنا باقی ہے۔ مزید براں اب یہ مسئلہ صرف ایک ادارے کا نہیں ہے بلکہ پوری قوم کا ہے اور اگر ہم ذرا گہرائی سے صورتحال کا جائزہ لیں تو اِس کی جڑیں ہمارے سماجی اور معاشرتی رویوں میں پیوست ہیں۔ ہم من حیث القوم کسی بھی چیز کی ذمہ داری قبول کرنے سے عاری ہو چکے ہیں۔ چاہے عامر لیاقت حسین کی ویڈیو ہو یا مہران بیس پر حملہ ہمارے Responses یکساں ہیں۔ کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔

یہ دو انتہائی مختلف واقعات ہیں لیکن دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ریسپونس Response ایک ہی ہے۔ ''یہ میرے مخالفوں کی سازش ہے۔'' آج تک ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی میں ہمارے پاس کتنی ایسی مثالیں ہیں جہاں کسی نے ذمہ داری Accept کی ہو اور جس میں اتنا character ہو کہ اِس میں اپنی ناکامی کی ذمہ داری قبول کرنے کا حوصلہ ہو۔ اگر ہر چیز ہمارے خلاف سازش ہے تو اِس کا ایک ہی مطلب ہے کہ ہم بالکل صحیح ہیں۔ ہم میں کوئی خامی نہیں ہے یا تو یہ گردشِ حالات ہے یا یہ دشمنوں کی سازش۔ ہم کب تک اِس طرزِ عمل پر کاربند رہیں گے۔ ہم جس دلدل میں دھنس رہے ہیں وہ آصف زرداری کی بنائی ہوئی نہیں

ہے۔ یہ ہماری خود کی تخلیق ہے۔اگر ہم اپنی ناکامیوں کو قبول نہیں کر سکتے تو بھول جائیں کہ ہم ترقی کر سکتے ہیں یا کوئی باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ظاہر ہے پہلے یہ مانیں گے کہ ہم ناکام ہوئے تو تب ہی کوئی بہتری کا سوچیں گے ورنہ اگر ستاروں کی چال یا سازشوں میں ہی پھنسے رہنا ہے تو اِس کا نتیجہ تو یہی نکلے گا۔

کچھ دن پہلے ایک اخبار میں پاکستان سے متعلق مختلف مما لک کے عوام کی آراء کے اُوپر ایک خبر تھی۔ دلچسپ پہلو یہ ہے جن مما لک کو ہم اپنا بڑا دوست تصور کرتے ہیں اُن تمام مما لک کی عوام میں ہماری حمائیت میں واضح کمی ہوئی ہے۔یاد رہے کہ یہاں ہم حکومتوں کی نہیں بلکہ عوام کی رائے کے بارے بات کر رہے ہیں لیکن اب اِس کو ہم کیا کہیں گے بُرا یا CIA کی سازش۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اِس کے بعد ہم کو سازشوں کی ضرورت ہے کیا۔

ہماری خواص اور عوام دونوں کو بہت تحمل سے سوچنے اور غور و خوض کی ضرورت ہے۔ہمیں اپنے رویوں پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ہم کتنی دیر شتر مرغ کی طرح ریت میں گردن دبائے رہیں گے۔ہم کو نہایت سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا اصل دشمن کون ہے۔ویسے جو ہمارے حالات ہیں ہم کو کسی دشمن کی کیا ضرورت ہے۔ہم اپنے ہاتھوں سے ہی خود اپنی قبر کھود رہے ہیں۔

جب تک ہم اپنی آنکھیں اور دماغ کھول کر پہلے اپنے آپ اور پھر اپنے دشمنوں کو نہیں پہچانیں گے تب تک یہی ہوگا۔آپریشنز بھی ہوں گے اور دہشت گردی بھی بڑھے گی۔جمہوریت بھی ہوگی اور اِس جمہوریت کے لبادے میں ہم بدترین آمریت کا شکار ہوں گے اور اسی طرح کے بونے ہمارے حکمران ہوں گے اور ساری دُنیا ہمارے خلاف سازشوں میں مصروف ہوگی۔

پاکستان 04-09-2012

لمحہ فکریہ

مشترکہ تہذیبیں صدیوں کے میل تال سے جنم لیتی ہیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

اسکندریہ میں سومہ سٹریٹ جس کا موجودہ نام نبی دانیال سٹریٹ ہے میں حضرت دانیال کا مقبرہ ڈھونڈنے میں جس تخجل خواری کا سامنا ہو رہا تھا اُس نے زچ کر دیا تھا۔میری ساتھی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

ایک تو مجھے حضرت نبی دانیال کی سمجھ نہیں آتی کہ یہ کہاں کہاں دفن ہیں۔سمرقند میں ان کا مزار مبارک ہے۔زمانوں سے سُنتے آئے ہیں۔اب یہاں کیلئے پاگل ہو رہے ہیں۔حنانی شیلی گوگ کے پاس ایک بہت بڑی دوکان میں جا گھسے۔مالک شاید باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔بٹھالیا۔پتہ چلا تھا کہ مراکش کا یہودی تھا جو ڈیڑھ صدی قبل یہاں شفٹ ہوا تھا جس کے عزیز رشتہ داروں کی ایک اکثریت اسرائیل نقل مکانی کر گئی تھی۔چائے بسکٹ آگئے تھے۔ہم نے بھی سوچا کہ چلو ذرا تبادلہ خیال ہی ہوگا اور چائے بھی تازہ دم کرے گی۔میرے لیئے بھی کسی یہودی سے باتیں کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔وہ سفاردی یہودی تھا۔سفاردی یہودی اسپین سے عیسائیوں کے غلبے کے بعد سلطنت عثمانیہ میں پناہ لینے والے یہودی ہیں جو عرب یہودی کہلاتے ہیں۔

میں نے پوچھا آپ کیوں نہیں شفٹ ہوئے وہاں؟

''ارے بھئی میں تو اسرائیلی مملکت کے ہی خلاف ہوں۔''

میرے تعجب بھرے اظہار پر انہوں نے کہا۔

بھئی ایسی سوچ رکھنے والا میں اکیلا آدمی نہیں۔فلسطین میں رہنے والے یہودیوں کی ایک اکثریت اِس ریاست کے خلاف تھی۔ارے بھائی زمانے گزر جاتے ہیں۔صدیاں بیت جاتی ہیں تب کہیں جا کر مختلف قومیں اور مختلف نسلیں باہمی میل جول سے اپنی تاریخ بناتی ہیں اور مشترکہ تہذیب وجود میں آتی ہے۔اسرائیل میں آنے والوں لوگوں میں کون ہیں؟ روس،پولینڈ،جرمنی،انگلینڈ،امریکہ،فرانس بھانت بھانت کے لوگ اوران کا کلچران کی مختلف زبانیں۔اس پر ان کا یورپی ہونے کا تکبر اور غرور جو ابھی بھی ہے۔مختلف گروہ مختلف کالونیوں میں بٹے ہوئے۔یہ روسیوں کی کالونی ہے،یہ جرمنوں کی ہے،یہ امریکیوں کی ہے۔دُنیا عرب کے یہودی مذہبی اختلافات کے باوجود زمانوں اکٹھے رہنے کے بعد ایک مشترکہ ثقافت اور زبان میں بندھے ہوئے تھے۔

ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔یروشلم میں رہنے والے سفاردی Sephardic خاندانوں کے لوگ عربی موسیقی کے بے حد دلدادہ تھے۔ہر کوئی عرب شاعر سلامہ حجازی،محمد العاش کی شاعری پر سر دھنتے تھے۔عرب کافی ہاؤس Coffee House میں شعر و نغمہ کی محفلیں سجاتے۔ہر کوئی جارج العبید کے مصری گروپ کا سماع سُننے کا شیدائی رہتا اور ہوا کیا؟ یہ خوبصورت سا ورثہ مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا۔وہ اس کا بیڑہ غرق کرنا چاہتے تھے۔سو کچھ تو کر دیا ہے جو باقی بچا ہے وہ کر رہے ہیں۔مختلف مذاہب کے اکٹھے رہنے سے ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور رواداری جیسے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو معاشروں کی بلوغت کیلئے بہت ضروری ہیں۔

مجھے یہ سب باتیں گذشتہ دنوں سندھ کے حالات اور وہاں زمانوں سے بستے ہندوؤں کی بھارت نقل مکانی کے سلسلے میں یاد آئی ہیں کہ بھتہ مافیا،مذہبی تعصب اور عدم تحفظ کی وجہ سے سینکڑوں ہندو خاندان بھارت منتقل ہو چکے ہیں اور ابھی بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔واہگہ بارڈر پر ہندوستان جانے والے بہت سے خاندانوں کے سامان بتاتے ہیں کہ وہ پاکستان چھوڑ رہے ہیں اور یہ ہمارے لیئے سوچنے کی بات ہے۔

اقلیتیں اگر دوسرے درجے کے شہری ہوں ۔ان کے جان و مال کو تحفظ نہ ہو   کہیں تبدیلی مذہب کی زور زبردستی ہو۔ریاست نے غنڈوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہو۔عدالتوں میں ان کی کوئی شنوائی نہ ہو تو پھر کون رہے گا؟ سمجھ نہیں آتا کہ مذہب کا ریاسی کاروبار سے تعلق کو کیوں استعمال کیا جارہا ہے۔رنگ و نسل ،عقیدے کی بنیاد پر امتیاز یا خون ریزی کی اجازت کیوں ہو۔اگر کہیں کوئی واقعہ وقوع پذیر ہو تو فی الفور ایکشن لیا جانا چاہیے۔یہاں ہمارے سربراہ قتل و غارت کی وارداتوں کے بعد بیان جاری کرتے ہیں۔بس بہت ہو گیا۔Enough is Enough مگر آپ اس کی روک تھام کیلئے کر کیا رہے ہیں ۔گلگت،کوئٹہ،کراچی میں شیعہ کمیونٹی کا منظم قتل عام جاری ہے جس میں گذشتہ سال بھر سے شدت پیدا ہوئی ہے۔اس قتل عام کی ذمہ داری لشکر جھنگوی اور جند اللہ نے قبول کی ہے۔اب کوئی ارباب اقتدار سے پوچھے آپ نے کیا ایکشن لیا؟ کیا مجرموں کو پکڑا انہیں سزائیں ہوئیں؟ تو جب یہ سب نہیں ہو گا تو ظاہر ہے لاقانونیت تو بڑھے گی جس کا مظاہر ہم دن رات اپنی سوسائٹی میں دیکھ رہے ہیں۔

امریکہ کو ہم کس قدر لعن طعن کرتے ہیں ۔مگر وہاں لوگ اپنے اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں ۔امریکہ میں جس سرعت سے اسلام پھیل رہا ہے خیال ہے کہ آئندہ برسوں میں وہ امریکہ کا دوسرا بڑا مذہب ہو گا اور یہ سب برداشت اور رواداری کے زمرے میں آتا ہے۔

پاکستان   14-09-2012

لمحہ فکریہ

سلیم صافی۔ تاریخ کو حقائق کے ساتھ جانیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

منگل 25 ستمبر کو جنگ میں سلیم صافی کا کالم ''تقلید یہود۔ کیوں اور کیسے؟'' میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جب اُن کی آبادی بھی زیادہ نہیں تو پھر کیا دُنیا پر اُن کی گرفت کی وجہ ان کی بہادری یا احتجاج ہے۔ تحقیق کے نتیجے میں اس کا جواب بھی نفی میں ملتا ہے۔ یہودی محنتی اور مشنری بلا کی حد تک ہیں لیکن اُن کا شمار بزدل اقوام میں ہوتا ہے۔ اسرائیل کے سوا دُنیا کے کسی خطے میں یہودیوں نے بندوق نہیں اُٹھائی۔ اسرائیل میں بھی یہ بندوق صرف اُن کی حکومت کے پاس ہے۔ ماضی قریب میں بھی کبھی اُن کو لندن، پیرس، ٹورنٹو، برلن یا واشنگٹن کی سڑکوں پر احتجاج کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دیگر قوموں کی نسبت وہ قانون کا احترام کرنے والے سمجھے جاتے ہیں۔

اُن کے کالم کا یہ حصّہ تاریخی حقائق کی نفی کرتا ہے۔

یہودی قوم کی غیر معمولی ذہانت اور غیر معمولی عیاری و مکاری، سودی اور حسابی ذہنیت تو مسلمّہ ہے اور مختصر کالم میں اس پر بحث ممکن نہیں۔ لیکن پہلے ذرا اِس امن پسند قوم کی دلیرانہ اور سازشانہ سرگرمیوں کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھ لی جائے۔

یہودی تاریخ دو صدی پیچھے کی ہو، قرونِ اولیٰ یا قرونِ وسطیٰ کبھی بھی کہیں بھی ایک پسندیدہ قوم نہیں رہی۔ سازشوں میں اُلجھی، ساہوکاری اور بینکاری کے چکروں میں پھنسی اور لوگوں کو پھنساتی، پندرہ سویں صدی میں پورے یورپ Europe کو گھیرے میں لے لینی والی تجارتی سرگرمیوں کی اہم ترین ایجنٹ اور بہت حد تک قابلِ نفرت قوم کے طور پر جانی جاتی تھی۔ یہودی احاطے Pale of Settlement (مراد یہودی بستیوں) پورے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے اور یہ احاطے مغربی اور مشرقی یورپ میں ابھرنے والی تمام سماجی اور سیاسی تحریکوں میں لیڈنگ کردار Leading Role ادا کر رہے تھے۔

انقلاب فرانس نے مغربی یورپ کے یہودیوں سے 1789ء میں حتمی اور دائمی آزادی یعنی انہیں یہودی احاطوں کی زمینوں میں برابر کے حصّے دار بنا کر قانونی شہریت دینے کا وعدہ کیا۔ مگر وعدہ وفا نہ کیا۔ یہود دشمنی قائم رہی اور اس کا بھرپور مظاہرہ اُس وقت سامنے آیا جب فرانسیسی فوج کے یہودی کیپٹن الفریڈ ڈریفس پر جرمنوں کیلئے جاسوسی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ فرانس میں بسنے والے یہودیوں نے جس طرح اِس واقعے پر احتجاج کیا اور پیرس کے گلی کوچوں میں یہود دشمنی کے نعرے بلند کیے اور عدالت کے کٹہرے میں حکومت کے خلاف بولے اُس نے اِس کیس کو دُنیا بھر میں شہرت دی۔ یہی وہ کیس تھا جس کی صحافیانہ رپورٹنگ کرنے وی آنا سے نکلنے والے اخبار THe Nelle Freie Press کا نمائندہ تھیوڈور ہرزل جو بعد میں صیہونیت کا نیا بانی بنا۔ جس کی شہرہ آفاق کتاب The Jews State نے یہودی دُنیا میں تہلکہ مچایا تھا۔ پیرس آیا تھا۔ اُس نے کورٹ کے احاطے میں چلاّتے، احتجاج کرتے لوگوں اور پیرس کے گلی کوچوں میں بھرپور احتجاج اور واویلا کے مظاہرے دیکھے اور یہی وہ مظاہرے تھے جو اُس کا ذہن یہودیت کی طرف موڑنے میں سنگِ میل ثابت ہوئے۔ انہی مظاہروں نے مشہور فرانسیسی ناول نگار ایملی زولا (Emili Zola) اور اس کے خوبصورت جملے I accuse نے شہرت بخش کر فرانسیسی سوسائٹی کے دائیں اور بائیں نظریات رکھنے والوں کو ڈریفس کی حمایت پر متحد کر دیا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں روسی انقلاب مشرقی یورپ کے یہودیوں سے یہی بات کہہ رہا تھا۔ ہمارے ساتھ انقلاب کی جدوجہد میں شامل ہوں۔ زاروں کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرنے والی قوم جو جبری بھرتی سے تنگ تھی کہ ان کے نوعمر بچے اگر روسی لڑکا اٹھارہ سال کا فوج میں بھرتی ہوتا تھا تو عمر کی یہ حد یہودی لڑکے کیلئے بارہ 12 سال تھی۔ یہودیوں پر کورس کے دوران سختی اور انہیں عیسائیت کی طرف راغب کرنے پر زور دیا جاتا۔ تاہم زار الیگزینڈر دوم اصلاح پسند زار

تھا۔کسانوں کی غلامی کے خاتمے کا قانون بنا کر اُس نے لوگوں کے دل جیتے تھے ۔بے شمار دوسری اصلاحات جو فوج ،میونسپل تنظیموں ،انصاف کی فوری فراہمی ،عدالتوں کے سینسر شپ کے قوانین پر نظر ثانی ،یونیورسٹیوں کی خودمختاری ،مقامی وصوبائی سطح پر منتخب اسمبلیوں کے ایجنڈے کا نفاذ اُس کے عزائم میں تھا۔مارچ 1981ء کی صبح وہ ایجنڈا اپنی جیب میں ڈالے اپنی شاہی بگھی میں بیٹھا سینٹ پیٹرز برگ میں پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کیلئے جا رہا تھا۔جب اُسے بم بلاسٹ میں مار دیا گیا اور یہ مارنے والا یہودی طالب آئی گرینوٹسکیا (Grinevitsky) تھا۔جو نرداونک Naradniks تنظیم کا ایک جوشیلا کارکن تھا۔نرداونک انقلابی تنظیم تھی جو زارشاہی کو چیلنج کرنے والا پہلا گروہ تھا جس کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی۔کہا جاتا ہے وہ اصلاحات ایسی تھیں کہ انہوں نے انقلاب کا راستہ روک دینا تھا اور یہی بات صیہونی گروپ کو ناپسند تھی۔اگر میرا ناقص علم غلطی نہیں کرتا تو یہ وہ پہلا بم بلاسٹ دہشت گرد تھا جس کے بعد میں ایسے دھماکوں کا رواج ہوا۔

اور یہی وہ سال تھا جب یہودیوں کو پوگرام (منظّم قتلِ عام) جیسے حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔چنانچہ زارشاہی اور روسی سیاسی کلچر نے مل کر پوری قوت سے یہودیوں کا قتلِ عام کیا۔یہ 1882ء میں یہودیوں کے تہوار پاس اوور Pass over کے موقع پر جنوبی روس کے شہر بالٹا میں ہوا اور اسی حادثے سے متاثر ہونے والے لوگ تھے جنہوں نے بعد ازاں ایک دستاویز یہودی پروٹوکولز لکھی جس میں یہودیوں پر پوری دُنیا پر حکومت کرنے کی سازش کا الزام لگا۔

اِس سازش کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ ایک جعلی دستاویز تھی جو زار کے وہم پر مبنی فرضی قصہ تھا۔

اِس منظّم قتل و غارت نے یہودیوں کے رگ و پے میں جوش و غضب بھر دیا تھا۔

یہودیوں کو اعلیٰ صنعتوں میں ملازمت پر نہیں رکھا جاتا تھا کہ وہ بغاوتیں منظّم کرنے میں بہت طاق تھے ۔بائیلو رشیا لتھوانیا اور سوویت کی کوئلے کی کانوں میں یہ شہرت اپنے عروج پر تھی ۔کشیف کی تاریخ میں 1903ء کے خون ریز ترین پوگراموں کے بعد تھیوڈور ہرزل نے جب زارشاہی کے منسٹر سیاصلاف کونسٹنٹوچ پلیف سے ملاقات کی تو پلیف نے ذرا سے بھی تاسف کا اظہار نہ کرتے ہوئے ہرزل کو کہا تھا۔ساری خرابی اُن یہودیوں کی تھی جو انقلاب کی دھمکیاں دے رہے تھے ۔انقلابی پارٹیوں میں آدھے سے زیادہ رکنیت تو نوجوان یہودیوں کی ہے۔

ارگون Orgun ،حگانا Hagana اور اسٹرن Estern یہودیوں کے دہشت گرد جتھے تھے ۔پولینڈ کے شہر پلانسک میں پیدا ہونے والا ڈیوڈ بن گوریاں جو اسرائیلی ریاست کا پہلا وزیر اعظم بنا حگانا اُس کی دہشت گرد تنظیم تھی جس نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد فلسطین میں برطانوی فوجیوں کو بے دریغ مارا ۔جگہ جگہ اِن ٹولوں کی خون ریزی کی دہشت نے برطانوی فوجیوں کو فلسطین میں وقت سے پہلے فلسطین چھوڑنے پر مجبور کر دیا ۔یہی حال میناحم بیگن اور تیزاک شامیر جو اسرائیلی وزیر اعظم بنے ان کے دہشت گرد ٹولے ایٹزل اور لیہی تھے ۔دیر یاسین میں تباہی مچانے والے یہی لوگ تھے ۔

مصر میں انقلاب کے بعد کا آپریشن سوسانہ مصری یہودیوں کا منصوبہ تھا اور اگر یہ کہیں کامیاب ہو جاتا تو بڑے بھیانک نتائج پیدا ہونے تھے ۔

اسرائیل میں بسنے والے سفاردی (سپین سے آنے والے یہودی) اور اشکینازی (یورپی یہودی) کے درمیان بہت اختلافات ہیں ۔کوئی شک نہیں کہ ایک دوسرے کی مدد اور اتحاد موجود ہے ۔اپنی اپنی کالونیاں ہیں ۔یہ جرمن یا امریکن یہ یونانی یہ روسی ہے ۔منظّم اور محنتی لوگ ہیں ۔اسرائیلی مملکت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حق سچ کیلئے آواز اُٹھاتے ہیں ۔مگر یہ ہیں کتنے ؟5 کلو آٹے کی گندھی پرات میں چٹکی بھر نمک جتنے ۔

بہر حال ۔ایک بات ضرور ہے ۔

طاقتور ہمیشہ طاقتور نہیں رہتا اور کمزور ہمیشہ کمزور نہیں رہتا ۔یہ قانونِ قدرت ہے اور اسے یہودیوں نے نظر انداز کر کے حال میں موجود طاقت کے فلسفے کو مان کر ظلم و بربریت کی مثالیں قائم کر دی ہیں اور کر رہا ہے ۔اُس کا مستقبل فی الحال بہت تابناک ہے مگر کب تک ؟

پاکستان 29-09-2012

لمحہ فکریہ

31 لکشمی مینشن۔منٹو میوزیم

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

لاہور میں آج کل ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر ایک بہار سی آئی ہوئی ہے۔چلیئے شکر ہے اِن اعصاب شکن حالات میں خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا نصیب ہو جائے وہ بھی غنیمت ہے۔بارہ سے چودہ اکتوبر۲۰۱۲ء تک جناب عطاالحق قاسمی نے ادبی وثقافتی میلے کا اہتمام کیا۔پاکستان بھر کے نامور ادیب اور فنکاروں سے سجے اِس میلے نے بہت اہم موضوعات پاکستان میں کہانی کا عروج وزوال،سعادت حسن منٹو پر خصوصی مطالعہ،مصوری،موسیقی کا حال و مستقبل،محفل مشاعرہ،ادب و معاشرے پر میڈیا کے اثرات،کتاب میلہ اور کلاسیکی رقص کا احاطہ کیا۔ہر سیشن اپنے اندر دلچسپی کے کوناگوں پہلو سمیٹے ہوئے تھا۔وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی۔تین دن ادیبوں کا اکٹھے ہونا،ایک دوسرے سے ملنا،گپ شپ کرنا،سنجیدہ موضوعات سے اپنی ذہنی آبیاری کرنا پُر لطف تھا۔اُنیس نومبر کو اکادمی ادبیات کی طرف سے لاہور سینٹر کے جناب الطاف احمد قریشی نے منٹو کے حوالے سے منٹو کو خراج پیش کرنے کیلئے ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔اِس سیمینار کا افتتاح بھی ایک سیاسی شخصیت پنجاب کے گورنر جناب لطیف خان کھوسہ کر رہے تھے۔چھوٹے پیانے پر ہونے کے باوجود یہ ایک بھرپور تقریب تھی جسے کامیاب بنانے کیلئے الطاف احمد قریشی اور محمد جمیل کی ادیبوں سے رابطوں کی مسلسل کوششیں تھیں۔

گھر سے چلتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خیال تھا کہ وہاں ایک سوال اُٹھایا جائے کہ لکشمی مینشن میں منٹو کا گھر میوزیم بنایا جائے۔مجھے یاد ہے ماسکو یونیورسٹی کے اورینٹل لینگویج ڈیپارٹمنٹ Oriental Language Department کی ہیڈ ڈاکٹر لدمیلا جب لاہور آئیں تو فیض صاحب سے ملنے قبرستان تک جا پہنچی تھیں۔قبروں کے درمیان چلتے ہوئے فیض کو پڑھتی جاتی تھیں۔کچھ ایسا ہی حال میرا تھا کہ سینٹ پیٹرزبرگ پہنچ کر دوستوفسکی کے گھر جانے کیلئے جہاں اُس نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے اور جہاں اُس نے اپنی آخری شہرہ آفاق تخلیق برادرز کرامازوو The Brothers Karamazov لکھی تھی۔اور جو اب میوزیم بن گیا ہے اور جہاں اس کی ہر چیز محفوظ کی گئی ہے جسے دیکھنے کیلئے میں کس قدر بے چین تھی۔تقریب میں پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ الطاف احمد قریشی نے یہ تجویز گورنر پنجاب کو پیش کی اور اسے آج وہ منوانے کے زبردست خواہاں ہیں۔اللہ کرے میں نے بے اختیار دُعا کی۔اب ہم نے کوئی سدا اس دہشت گردی کی حالتِ جنگ میں ہی تو نہیں رہنا نا۔امن کے دن بھی انشاءاللہ آئیں گے۔ساٹھ،ستر اور اسی کی دہائیوں کی طرح غیر مُلکی سیاحوں کے ٹولے انشاءاللہ پھر اِدھر کا رُخ کریں گے۔ہمارا اولڈ لاہور تو ادب وثقافت کا گہوارہ رہا۔اس کی ہر گلی کوچے کو جہاں اور جس جگہ کسی نہ کسی شخصیت نے جنم لیا یا وہ رہا کو سجا دینے کی ضرورت ہے۔تکیہ مراثیاں کلاسیکل موسیقی کی ایک طرح یہاں پرورش ہوئی۔چوک نواب میں بڑے غلام علی خان کا گھر۔مسجد وزیر خان چوک میں موسیقی کے عاشق حیات محمد خان مرحوم کا گھر۔اندرونی بھاٹی گیٹ کے محلے چومالہ میں برصغیر کے مایہ ناز فنکار محمد رفیع کا گھر۔میرزا ادیب کا گھر بھی یہیں۔علامہ اقبالؒ سے لے کر فیض،ناصر کاظمی جن کے قدموں نے اِن گلیوں کو سجایا کچھ ایسا ہی حال پاکستان کے دیگر شہروں اور صوبوں کا ہے۔ہر صوبہ اپنے ادبی وثقافتی حوالے سے اہم ہے۔ہم تھوڑی سی توجہ سے اپنے مُلک کو کتنا مالا مال کر سکتے ہیں؟سعادت حسن منٹو صاحب کی بڑی بیٹی نگہت پٹیل میرے ساتھ بیٹھی تھی۔وہ لکشمی مینشن کے اسی گھر میں رہتی ہیں جو منٹو کا گھر ہے۔میرے پوچھنے پر اُس نے کہا تھا کہ وہ گھر کمرشل ایریا میں آ گیا ہے۔بیڈن روڈ کے تاجر اُن گھروں کو خرید کر کمرشل مارکیٹ بنانا چاہتے ہیں۔ہمارے لیئے اس کے کمرشل ہونے کی صورت میں بہت مسئلہ ہو گا۔انسان جان کے ساتھ سو سیاپے ہوتے ہیں۔

اس گھر کو تو جناب ہر صورت میوزیم بننے کی ضرورت ہے۔آج الطاف احمد قریشی کے اِس مطالبے پر ہم اپنی آواز اس آواز میں شامل کریں گے۔

''لیکن ابا جان کی کوئی چیز محفوظ نہیں'' نگہت نے پریشانی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ ماسکو سے کوئی ساٹھ ستر میل کی دُوری پر یا سنایا پولیانہ جہاں ٹالسٹائی کا گھر جہاں وہ پیدا ہوا جہاں اُس نے اپنے ادبی شہ کاروں کی تخلیق کی وہاں اُس کی کوئی بھی چیز اصلی نہیں رہی تھی کہ دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجوں نے ماسکو پر حملے کے دوران یا سنایا پولیانہ پر قبضہ کرلیا تھا اور گھر کی ہر چیز حتیٰ کہ درخت تک کاٹ ڈالے تھے۔ کمبخت قبر کی بے حرمتی کرنے سے بھی باز نہ آئے۔ ایسا ہی سلوک اُنہوں نے چیخوف، ریمسکی اور ترگنیف کے گھروں کے ساتھ کیا مگر جنگ کے بعد سٹالن حکومت نے ایک ایک جگہ کو ماہرین کے مشوروں سے سیٹ کردیا۔ اگر گورنمنٹ چاہے تو سبھی کچھ ہوسکتا ہے۔ ادبیات اکادمی پاکستان کے نئے چیئرمین جناب عبدالحمید کو محکمہ ڈاک سے ٹرانسفر ہوکر یہاں آئے ہیں وہ خطاب کیلئے سٹیج پر آئے تو بشریٰ رحمٰن جو میرے دوسرے ہاتھ بیٹھی تھیں نے خوب ہنسایا۔

میں نے تو کہا تھا۔ ارے ہماری حکوت کو کہیں غلطی تو نہیں لگی۔ بھئی یہ اکیڈیمی آف Letters وہ خطوط والی نہیں ہے۔ یہ الف، ب، پ والی یعنی پڑھنے لکھنے والی ہے۔

مگر صاحب دُبلے پتلے سے وجود والا جو بندہ وہاں کھڑا چھ ماہ کی کارگزاری کی رپورٹ اور اپنے آئندہ عزائم کے بارے میں بات کرتا تھا وہ اُس کے خلوص اور نیک نیتی کا اظہار تھا کہ بیچاری اکیڈیمی آف لیٹرز Academy of Letters کا تو ریلوے کی طرح بیڑہ غرق ہوگیا تھا۔ ادبیات کے دو شماروں کا انگلش اور اُردو میں چھ ماہ کے عرصے میں چھپنا بہت خوش آئند تھا۔ مقامی زبانوں کے اچھے شعرا کی شاعری کا چینی اور انگریزی میں تراجم کا سلسلہ بھی ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ وہ اِس سلسلے میں ڈاکٹر صُغرا صدف ڈی جی پنجابی کمپلیکس سے جس طرح تعاون مانگ رہے تھے وہ اُن کی خلوص نیت کو ظاہر کرتا تھا کہ بندہ کام کرنا چاہتا ہے۔

جناب لطیف کھوسہ کی تقریر بہت خوبصورت تھی۔ سُننے میں مزہ آرہا تھا مگر مزے کے منہ میں اُس وقت روڑ آجاتے تھے جب صاحب تقریر اٹکتے تھے اور لفظوں کو پڑھ نہیں پاتے تھے۔ عقبی نشست سے کسی نے کہا تھا۔ تقریر تو الطاف احمد قریشی جیسے صاحب علم بندے کی لکھی لگتی ہے مگر کیا تھا تکلیف کرکے تین چار بار پڑھ بھی دیتے۔

تاہم گورنر صاحب نے جو خوبصورت بات کی وہ 31 لکشمی مینشن میں منٹو کے گھر کو میوزیم بنا دینے کی تھی۔ جس کی تائید ہم سب نے پُرجوش طریقے سے کی۔

اللہ کرے یہ وعدہ وفا ہوجائے۔

منٹو کے حوالے سے اُن کے فن پر خوبصورت باتیں ہوئیں۔ خالد سنجرانی، مسعود اشعر، ڈاکٹر سعادت سعید اور قاضی عابد کی باتیں۔

اِس تقریب کا ایک خوش آئند پہلو اس کا کم خرچ بالانشین کے زمرے میں آتا ہے۔ ادب کی ایک شخصیت کو بھرپور خراج اور ایک اہم پوائنٹ کا اُٹھانا۔ خدا اِسے تکمیل دے۔ (آمین)

پاکستان 24-10-2012

لمحہ فکریہ

آپ کی توجہ چاہیئے جناب شہباز شریف صاحب

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

ایک انتہائی افسوسناک خبر اخبارات کے پہلے صفحے پر درج تھی۔ کریم پارک میں فاروقی اسکول سے متعلق۔ طالبات توہین رسالت پر مبنی جملوں والا مضمون گھروں میں لے کر گئیں۔ والدین اور اہلِ علاقہ میں زبردست اشتعال۔

فاروقی گرلز سکول لوئر مڈل کلاس اور غریب لوگوں کے بچوں کیلئے ایک نعمت خداوندی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ گزشتہ پندرہ اٹھارہ سالوں سے ممکن ہے یہ دورانیہ اس سے بھی زیادہ ہو بہترین نتائج کا حامل رہا ہے۔ کوئی سال ایسا جاتا ہو جب اس کے بچوں نے بورڈ میں پوزیشن نہ لی ہو۔ ایک دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ بورڈ کی تینوں پوزیشنیں ان کے بچوں کی تھیں۔ ان کے پاس کیا چیز ہے؟ جو انہوں نے پوزیشن کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ میں خود کریم پارک گئی۔ میں نے کلاسوں کا معائنہ کیا، معلومات لیں اور یہ جانی کہ دونوں میاں بیوی کی انتھک محنت کا یہ سب ثمر ہے۔ بچوں کی لکھائیاں تھیں کہ جیسے موتی پروئے تھے۔ نہم دہم کے طلبہ چار بجے تک سکول میں پڑھتے۔ ایک ایک مرحلے پر اُن کی نگرانی ہوتی۔ اب پوزیشن تو ایسے بچوں کا حق بنتا ہے۔ سکول کی غریبانہ سی عمارت سے نکلتے ہوئے مجھے دُکھ ہوا۔ میں نے عاصم فاروقی سے کہا۔ آپ کا سکول اِس علاقے کا نتائج کے اعتبار سے ایک سرمایہ ہے اِسے خوبصورت سی بلڈنگ بھی دیں۔ آپ جیسے سر پھرے لوگ جب کام کا آغاز کرتے ہیں تبھی ادارے بنتے ہیں۔ ہمارے سامنے علی گڑھ یونیورسٹی، کیمرج اور آکسفورڈ کی مثالیں ہیں۔ آپ ہنسیئے نہیں میری اِس مثال پر۔ آغاز اُن کا بھی ایسا ہی تھا۔ ہمارے ہاں سکولوں کیلئے کرایے کی بلڈنگز کا رواج ہوگیا ہے مگر یہ بچوں سے اُن کی طالب علمی کو وہ حصّہ چھین لیتی ہیں کہ جب وہ زمانوں بعد کہیں پلٹ کر اپنے سکول کو دیکھنے آتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ وہاں کوئی پلازہ بنا ہوا ہے۔ کوئی مارکیٹ بنی ہوئی ہے اور وہ حسرت سے کہتا ہے ارے وہ میرا سکول کہاں گیا؟ اُس کا سکول ہمیشہ وہیں رہنا چاہیئے۔ اُس کے کمرے، اُس کے برآمدے، اُس کا صحن، اُس کی شرارتیں، اُس کی دوستیاں سب محفوظ ہونی چاہیئے۔ ہم اگر اپنی قوم کے بچوں کو یہ تحفہ دے سکیں تو ہمیں اسے دینا چاہیئے۔ آپ کی بات میں بہت وزن ہے۔ مجھے بہت سالوں بعد علم ہوا تھا کہ انہوں نے بہت اچھی عمارت سکول کیلئے بنائی۔ لاہور کا کونسا چوٹی کا کالج ہے جہاں اس ادارے کے بچے صرف اور صرف میرٹ پر نہیں گئے۔ خود جناب شہباز شریف اِس ماہر تعلیم جوڑے کو جانتے ہیں کہ انہوں نے متعدد بار بورڈ کے نتائج پر جناب عاصم فاروقی اور ان کی اہلیہ کے ساتھ ان کے بچوں کو انعامات دیتے ہوئے انہیں سراہا ہے۔ جناب وزیر اعلیٰ آپ سے بڑا کون تعلیمی مراحل کو سمجھنے والا انسان ہے۔ آپ نے کروڑوں اور اربوں کے سرمایے سے شاندار عمارات کھڑی کیں۔

مسئلہ تو تھوڑا سا برداشت کا تھا صبر اور حوصلے کا۔ ایک ٹیچر کی کوتاہی کا کہ نبی پاکؐ کی ذات مبارک پر ایک مضمون گائیڈ سے لکھتے ہوئے ایک صفحہ چھوڑ گئی۔ اگلا صفحہ کسی اور کے بارے میں تھا جو بے ایمان اور چور تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ ٹیچر خود اِسے لکھ رہی تھی یا اپنی کسی شاگرد سے لکھوا رہی تھی۔ غلطی بہت بڑی کہ اُسے پڑھا نہیں۔ فوٹو کاپیاں کروائیں اور بچیوں میں بانٹ دیں۔

کچھ والدین نے فوراً رابطہ کرکے صورت حال کی وضاحت چاہی۔ علاقے میں اشتعال پھیلا تو سمجھدار والدین کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت تھی۔ عاصم فاروقی اور ان کی اہلیہ نے علاقے کے معزز افراد اور پی ایم اے اور مسجد کے مولانا کی خدمت میں عرض کی کہ وہ معافی مانگتے ہیں۔ ایسا غلطی کی وجہ سے ہوا۔ ہم نے اُس ٹیچر کو بھی فارغ کر دیا ہے مگر کوئی شنوائی نہیں تھی۔

سامان کی توڑ پھوڑ اور فرنیچر کو آگ، عمارت کا گھیراؤ، سنگ باری اور اب انہیں سیل کر دیا گیا۔ ایک بہترین ادارہ کس تعصب اور نفرت کی بھینٹ

چڑھا۔میرے نبیؐ تو صبر اور ایثار کی مثال تھے ہم اُن کے اُمتی کیا روایات قائم کر رہے ہیں؟ آٹھ ہزار طالبات گھر بیٹھی یقیناً پریشان ہوں گی کہ جنہیں پڑھنا ہے اور جنہیں بورڈ میں پوزیشنیں لینی ہیں۔

اور ایک ماہر تعلیم آدمی جس کی زندگی کے تیس سال بچوں کو تعلیم دیتے گزر گئے جس کے کالے بال سفید ہو گئے جس کے دیئے گئے بہترین نتائج پر پورا لاہور رشک کرتا تھا کو حراست میں لے لیا گیا۔جس کی آنکھوں کے سامنے اُس کی متاعِ عزیز کو تباہ کر دیا گیا۔

ہمارے صوبے کا وزیر اعلیٰ تعلیم سے محبت کرنے والا انسان ہے۔ایک عالیشان ادارے کو تباہ ہونے سے بچائیں اور ان کا وقار بحال کریں۔

پاکستان 02-11-2012

لمحہ فکریہ

غزہ میں بہنے والا خون

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

تین چار دنوں سے غزہ پر اسرائیل کی بمباری کی خبریں طبیعت میں دُکھ اور ملال کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی مسلسل اُٹھاتی ہیں۔ پروردگار مسلمانوں کی یہ بے حسی کب ختم ہوگی؟ کب میرے پروردگار؟

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہی برطانیہ اور اس کے حواری ٹولوں نے مشرقِ وسطیٰ کی چیر پھاڑ اور عرب قومیت کا فتنہ جگا کر فلسطینی مسلمانوں کے سینے میں صیہونیت کا بیج بو کر اسے دوسری جنگِ عظیم تک ایک تن آور درخت بنانے کی جو جو سازشیں کیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ 1946ء میں فلسطینی سرزمین میں یہ یہودی شمالی اور شمال مغربی پٹی جو بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے چاول کے دانوں کی طرح کہیں کہیں بکھرے ہوئے تھے۔ صرف ایک سال بعد 1947ء میں بیرشیبا سے نیچے جنوب اور ساحلی پٹی کا حصہ تل ابیب سے حیفہ، عکہ سب اسرائیل نے کہیں خریداریوں سے اور کہیں ظلم و ستم کی داستانیں رقم کرتے ہوئے حاصل کر لیا تھا۔ یروشلم اور تل ابیب کے درمیان کا علاقہ جو دیر و یاسین کہلاتا تھا اُسے حاصل کرنے کیلئے جس انداز میں اُس پر بلڈوزر چلائے گئے۔ راتوں رات حگانا، اسٹرن اور لیہہ جیسے دہشت گرد ٹولوں جنہیں حکومتی افراد کی حمایت حاصل تھی نے جس طرح خون ریزی کی۔ گھروں کے گھر جن میں سوتے لوگ، بچے اور عورتیں سب اس ظلم کی بھینٹ چڑھے۔ اس کی مثال صرف نازیوں کے ہاں ملتی ہے جس ظلم کا شکار یہ یہودی کل جرمن نازیوں کے ہاتھوں ہوئے تھے اُسی تاریخ کو انہوں نے دیر و یاسین میں دہرایا تھا۔ 1949ء سے 1967ء تک یروشلم سمیت مزید حصے ہتھیا لیے گئے اور 2010ء میں فلسطینیوں کی وہ حالت تھی جو 1946ء میں یہودیوں کی تھی۔

غزا کا علاقہ ایک چھوٹی سی مستطیل پٹی کی صورت میں بحیرہ روم کے ساتھ جڑا ہوا ہے جس کا چھوٹا سا رابطہ صحرائے سینا کے ساتھ ہے کو اس پر بھی اسرائیل قابض رہتا ہے۔ غزا کی آبادی تقریباً ایک ملین افراد پر مشتمل ہے اس میں مہاجروں کی اکثریت ہے۔ غزہ میں یہ مہاجر خیمہ بستیوں میں رہتے ہیں یہ وہی بدقسمت لوگ ہیں جنہیں ان کے گھروں سے سنگینوں کے بل بوتے پر نکال دیا گیا۔ جن کے بچوں کیلئے سکول نہیں، جن کے پاس روزگار نہیں۔ جو اپنی زمینوں سے محروم ہو کر دیہاڑی دار مزدور بن گئے ہیں۔ ہر روز صبح شناخت کے مرحلوں سے خود کو گزار کر یروشلم اور دیگر شہروں میں داخل ہوتے ہیں اور اگر ان مرحلوں سے گزرنے میں لیٹ ہو جائیں تو دیہاڑی گُل کر بیٹھتے ہیں۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں ایک فلسطینی اپنے روز و شب گزار رہا ہے اور ان کی زمینوں پر یورپ سے آئے ہوئے یہودیوں کیلئے زرعی فارم اور settlements بنائی گئیں جہاں بہترین پھل پیدا کیے جا رہے ہیں اور جن کی یورپ کے مُلکوں برآمد ہوتی ہے۔

فلسطینیوں کے پاس دوسرا علاقہ ویسٹ بنک ہے۔ ویسٹ بنک میں بیت المقدس کا مشرقی علاقہ بیت اللحم، ہیبرون، راملہ اور وادی اُردن کا کچھ علاقہ ہے۔ قدیم تہذیبی تاریخ میں یہی جگہ سمیریا Samaria اور جودیا Judea ہے جو اسرائیلوں کیلئے انتہائی اہم ہے اور جسے حاصل کرنے کے وہ اب درپے ہیں۔

بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں تو اپنی جگہ مگر اگر مسلمان اپنے آپ کو عمل کی کسوٹی پر پرکھیں تو حقائق سامنے آتے ہیں۔

ہمارے ہاں آجکل کیا ہو رہا ہے؟ بیان بازیاں، اسرائیلی اور امریکی پرچم کا جلانا۔ کہیں کہیں ٹُٹے پھُٹے جلوس اور نعرہ بازیاں۔

بھئی آپ جلاتے رہیں ان کے پرچم۔ نعرے لگاتے رہیں۔ اس کا فائدہ جب عمل نہیں کرنا۔ نہ اپنی اصلاح نہ قوم کا خیال جو بندہ جہاں اور جس حال میں ہے صرف اور صرف اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہے۔ سارے دعوے سارے نعرے کھوکھلے۔ قدرت کے فیصلے ہمیشہ میرٹ پر ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل کی پُشت پناہی امریکہ کر رہا ہے۔ یہ اس کی مجبوری ہے کیونکہ امریکہ کے طاقتور اور با اثر ترین یہودی اسرائیل کی پُشت پر ہیں۔ اس کی ایک مثال اس واقعے سے

سمجھی جاسکتی ہے کہ 1973ء کی جنگ میں ایڈمرل تھامس موورر جائنٹ چیف آف سٹاف اور اسرائیلی ملٹری اتاشی مورڈیکائی گور کے درمیان ایک تلخ مکالمہ ہوا۔ گور کا مطالبہ تھا کہ امریکہ اسرائیل کو فضاء سے زمین پر مار کرنے والے میورک Maverick ٹینک شکن میزائل سے آراستہ جنگی ہوائی جہاز فراہم کرے۔ موورر نے وضاحت کرتے ہوئے کہ امریکہ کے پاس ایسے ہوائی جہازوں کا صرف ایک ہی سکواڈرن ہے اور اگر یہ بھی دے گیا گیا تو کانگرس میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ موورر کا کہنا تھا کہ گور نے کہا ''تم جہازوں کا بندوبست کرو! کانگرس کو میں سنبھال لوں گا''۔ موورر کا کہنا ہے کہ اس نے ایسا ہی کر دکھایا! ''میں نے آج تک کوئی بھی صدر ایسا نہیں دیکھا جو اسرائیل کے خلاف جاسکے! وہ جو بھی چاہتے ہیں ہمیشہ حاصل کر لیتے ہیں''!

اب ذرا اپنے لوگوں کے کردار دیکھیے۔ سعودی عرب، کویت، اُردن، کیا یہ اِس قابل نہیں کہ وہ امریکہ پر کسی نہ کسی انداز میں اثر انداز ہوں کہ اسرائیل اپنی اِس آئے دن کی جارحیت سے باز آئے۔ جب اور جس وقت اس کا جی چاہتا ہے کہ بمباری شروع کر دیتا ہے۔ سکولوں، شفاخانوں کو ٹارگٹ کرتا ہے۔ معصوم بچوں کو خون میں نہلا دیتا ہے مگر افسوس اُسے کسی کا ڈر خوف نہیں۔ عرب لیگ کے اجلاس میں قراردادیں منظور ہورہی ہیں کیا کریں گی یہ قراردادیں؟ کچھ بھی نہیں۔

مسلمان جب تک اپنی اغراض کے پھندوں میں جکڑے رہیں گے اور متحد نہیں ہوں گے تب تک اُن کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہے گا اور اُن کا خون ایسے ہی بہتا رہے گا۔

پاکستان 21-11-2012

لمحہ فکریہ

راگ بدلے گئے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

بات ہے یہ جمعہ کی شام کی! اچھرہ شاپنگ سینٹر کے عین سامنے سڑک کنارے ایک بہت بڑے سائن بورڈ کو میری آنکھوں نے حد درجہ تعجب اور صدمے سے دیکھا۔ جشن آزادی 14 اگست کا حوالہ، پاکستانی پرچم اور بڑی سی تصویر ہے امیتابھ بچن کی! قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا، حیرت زدہ گنگ سی مجھے تو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ یہ سب کیا ہے اور میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ ہمارے یوم آزادی سے امیتابھ بچن کا کیا تعلق؟ پروردگار! ان کیبل والوں کی دن رات انڈین فلمیں دکھانے کے نتائج، جیو اور دیگر چینلوں کی کاوشیں آخر رنگ لا رہی ہیں کہ ہمارے ذہن اس حد تک متاثر ہو گئے ہیں کہ ہمیں اپنی تاریخ، اپنے قومی دن اور ان دونوں سے منسلک شخصیات کچھ بھی یاد نہیں۔ کام کسی اندرونی، بیرونی کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا ہو، کسی بھی آئیڈیا کو سکرین یا سائن بورڈ پر لانے سے قبل اس پر بحث ہوتی ہے، اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ایسے جائزوں اور مباحثوں میں کوئی کمبخت پاکستانی ایسا نہیں تھا جو نشاندہی کر سکتا کہ یہ کیا ستم ڈھا رہے ہو؟ کیا ہم اتنے بے حس، اتنے بے ضمیر اور اتنے بے غیرت ہو گئے ہیں؟

ذرا 9 اگست کی طرف آیئے۔ ہماری فضائیہ کے چیف ائیر مارشل تنویر محمود بیان دیتے ہیں کہ پاکستانی وزیر اعظم کو بھی لبنانی وزیر اعظم کی طرح رونا نہیں پڑے گا۔ مجھے احساس ہے بے شمار پاکستانیوں کا دل اس خبر کو پڑھ کر خون ہوا ہوگا۔ ہمارا یعنی دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت والے ملک کا موازنہ ایک ایسے ملک سے ہو رہا ہے جس کی کوئی باقاعدہ فوج ہی نہیں، یہی کوئی 25/20 ہزار فوج بغیر سامان حرب کے! سچی بات ہے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

پر جب غیر ملکی رپورٹیں پڑھنے کو ملتی ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بیچارے بھی کیا کریں، گاہے گاہے ایسے بیان دے کر لوگوں کو اپنے بارے میں تازہ ترین صورت سے تو آگاہ رکھیں کہ کل کسی بھی ناگہانی صورت میں ان کی طرف سے خراب کارکردگی پر غریب عوام سکتے میں تو نہ آئیں!

انڈیا کے ڈیفنس اینلسٹ (Defence Analyst) سے کسی غیر ملکی نے سوال کیا کہ "آپ لوگوں کی اس درجہ جنگی تیاریوں کا ہدف کون ہے؟" جواب دیا گیا "چین!" سوال ہوا کہ اس سے پہلے انڈیا کا ٹارگٹ ہمیشہ پاکستان تھا، اب آپ لوگوں کو پاکستان سے کوئی خطرہ نہیں؟" ذرا اس کے جواب کو دیکھئے جو دیا گیا:

"پاکستان آرمی میں اب وہ پیشہ ورانہ مہارت نہیں رہی جو کبھی اس میں تھی جس کا مظاہرہ 1965ء کی جنگ میں ہوا، اب وہ زمینوں، پلاٹوں، عہدوں اور کرسیوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔"

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی یہ رپورٹ بھی توجہ طلب ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ سات سال میں آرمی نے بتدریج ملک کے معاشی وسائل پر اپنی گرفت مضبوط کی ہے۔

اب ہندوستان ٹائمز میں چھپنے والی یہ خبر بھی پڑھ لیجئے انڈین آرمی کے چند ٹاپ جنرلز کی بیگمات نے 'کارگل' پر فلم بنانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک جنرل کی بیٹی اور ایک کیپٹن کا ہیرو ہیروئن کے طور پر انتخاب کرنے اور سکرپٹ پر ورکنگ کے بعد پورا پلان ڈیفنس منسٹری کو منظوری کے لئے بھیج دیا۔ ڈیفنس منسٹر نے جواباً لکھا "فلمیں بنانا آپ لوگوں کا کام نہیں، جن کا یہ کام ہے وہ کریں یا نہ۔ آپ لوگ اپنے کام سے کام رکھیں۔"

اب اپنے ملک میں بھی دیکھ لیں۔ کسی شعبے پر انگلی رکھ دیجئے جوان لوگوں سے خالی ہو، بلا سے ان میں اس عہدے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔

منڈی میں جائیں، پیاز انڈیا کا، آلو انڈیا کا، ادرک انڈیا کا، اخبار کا صفحہ کھلتا ہے اتنے ٹن گوشت انڈیا سے آرہا ہے۔ کوئی یہ پوچھے یہ قوم گوشت نہیں کھائے گی تو مر جائے گی؟ ہائے رے کتنے داغ ہیں پنبہ کجا کجا نہم!

پاکستان 12-08-2013

لمحہ فکریہ

اب شام نشانے پر

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

میں اپنے قارئین پاکستان کی خدمت میں پھر حاضر ہورہی ہوں۔دراصل میں گذشتہ کچھ عرصے سے فلسطین پر ایک ناول لکھنے میں مصروف تھی ۔موضوع کی گھمبیرتا نے مجھے سرہی اٹھانے نہ دیا۔بہرحال لہورنگ فلسطین تکمیل کو پہنچ کر کتابی صورت میں مارکیٹ میں آیا تو میں آپ قارئین کے سامنے حاضر ہوئی۔

تو وہ وقت آگیا ہے جب دنیا کے تھانیدار نے اعلان کردیا ہے کہ ہم شام کے خلاف فوجی کاروائی کی تیاری کررہے ہیں۔ڈرامے کا وہی اپیسوڈ جوعراق پر حملے کے وقت تھا۔وہی کہانی جوتب تھی ۔صدام امر تھا۔صدام ظالم تھا۔صدام کے کردار پر کردوں کوقتل کرنے کاالزام بجامگر اس انسانیت کے ہمدردوں کا کیا کردار سامنے آیا۔کیا کیا چالیں چلی گئیں ۔شیعہ،سنی اور کردوں کولڑانے کی ۔اور وہ لڑ رہے ہیں۔ایک دوسرے کا تخم مار رہے ہیں ۔مسلمان کا گلا مسلمان کاٹ رہا ہے اور عراق صدام سے چھٹکارہ پا کر بھی تباہ ہو رہا ہے ۔

پاکستان جن مصائب اور الیوں سے گزر رہا ہے اور جیسے لہولہان ہورہا ہے ۔اس کا بڑا ذمہ دار بھی تو وہی ہے جوڈالروں سے سرکردہ لوگوں کو خریدتا ہے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے ۔اب شام کی باری ہے ۔اور وہی الزامات دہرائے جارہے ہیں۔بشارالاسد کو چاہیے کہ وہ اقتدار سے الگ ہوجائے ۔جیسے صدام کو چاہیے تھا مگر اس اقتدار کی ہوس بندے کواس پاتال میں پھینک دیتی ہے ۔جہاں قوموں کا بیڑہ غرق ہوتا ہے ۔

اب کوئی پوچھے کہ مصر میں جو کچھ ہورہا ہے ۔وہ جائز ہے ۔کیسے اسلام پسند عناصر کا تہ تیغ کیا جارہا ہے ۔وہاں اسرائیل اور مغربی طاقتیں سب سرگرم ہیں ۔مصری چیف اور نیتن یاہو کے درمیان تعاون جاری ہے ۔اسرائیل نے اُن تمام سرنگوں کو ملیا میٹ کردیا ہے۔ جو مصر اور غزہ کے درمیان تھیں اس ڈر سے کہ غزہ کے لوگ اخوان المسلمین کی مدد کیلئے نہ آجائیں۔سعودی عرب پر کیا افسوس کریں اورامام کعبہ کے بیانات پر کیا رائے زنی ہو کہ حکمرانوں کو صرف اپنا اقتدار عزیز ہے۔سوال ہے دوسروں کے مونڈھوں پر کب تک یہ اقتدار برقرار رہے گا۔

پاکستان کی جماعت اسلامی مصر پر آواز اٹھارہی ہے تو شام پر کیوں چپ ہے کیا وہاں مسلمان نہیں ہیں۔

دمشق، حلب اور حمس کتنے خوبصورت شہر ہیں۔کتنا تاریخی ورثہ اُن جگہوں پر بکھرا ہوا ہے۔یہ سب شہر میں نے دیکھے ہیں اِن کی خوبصورتی نے میرے دامن دل کو بار بار کھینچا تھا۔جن کا اب بیڑہ غرق ہورہا ہے۔شام کا انقلابی شاعر دنیا بھر میں اپنی انقلابی نظموں کے بل پر مشہور ہوا۔نظار قبانی جس کی آخری خواہش دمشق میں دفن ہونے کی تھی ۔دمشق میرے لیے رحم مادر کی طرح ہے۔آیئے میں اس کی وہ انقلابی نظم کے چند ٹکڑے آپ کو سناؤں۔

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

میں اس کی حمایت جاری رکھوں گا

جب تک نیو ورلڈ آڈر تقسیم ہوتا رہے گا

امریکہ اوراسرائیل کے درمیان

میں اس کی حمایت جاری رکھوں گا

اپنے سب لفظوں کے ساتھ

اپنی ساری توانائی کے ساتھ

جب تک یہ دنیا اُس قصاب کی گرفت میں رہے گی

میں دہشت گردی کی حمایت کروں گا

جب تک یہ نیو ورلڈ آڈر اپنی قصابیت کو جاری رکھے گا

میرے بچوں کو کتوں کے سامنے ڈالتا رہے گا

میں دہشت گردی کے ساتھ ہوں

28-08-2013 پاکستان

لمحہ فکریہ

قانون میرا ازرخرید

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

وہ جو ہمارے بزرگ تقسیم کے بعد پاکستان آکر بھی انگریزوں کے زمانوں کو اُن دنوں میں شدت سے یاد کرتے تھے جب ابھی پاکستان اس دہشت گردی سے آشنا نہیں تھا۔ جب بڑے بوڑھے برٹش راج کو خراج پیش کرتے ہوئے کہتے تھے۔ بیس تولے سونا پہن کر ایک عورت کلکتے سے پشاور تک بلا خوف و خطر سفر کر سکتی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ قانون طاقتور تھا۔ قانون کی حکمرانی تھی۔

ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے شہریوں نے ابھی حال میں ہی شاہ زیب اور شاہ رخ جتوئی سلسلے میں قانون کی جس طرح دھجیاں اُڑتے دیکھی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپ پیسے والے ہیں۔ آپ با اثر ہیں۔ آپ پاور میں ہیں تو آپ اور آپ کی اولادوں کو کھلی چھٹی ہے کہ جو اُن کا جی چاہتا ہے وہ کرتے پھریں۔ دل لگی اور مذاق میں، کہیں ذرا سے جھگڑے پر اشتعال میں آکر جب اور جس وقت چاہے جسے چاہیں قتل کردیں۔ جہازوں پر بیٹھ کر فرار ہو جائیں بلکہ فرار کروا دیئے جاتے ہیں۔ اگر کہیں شومئی قسمت عدالت کے ہتھے چڑھ جائیں تو ساری افسر شاہی اور ایلیٹ کلاس کو مصیبت پڑ جاتی ہے۔

سزا کا سُن کر مسکراتے ہوئے انگلیوں سے فتح کا نشان بناتے ہوئے باہر نکلتے ہیں۔ ڈوب مرنے کی بات ہے نا۔ فتح کا یہ نشان اٹھارہ کروڑ لوگوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ ایک کھلم کھلا پیغام ہے کہ قانون تو میرا ازرخرید ہے۔

اب سوسائٹی میں قصاص اور دیت کے حوالوں سے بحث و مباحثہ۔ لوگوں کے ردِعمل اور باتوں کے پٹارے۔ اتنے کروڑ اور آسٹریلیا میں سکونت۔ ایک ایسے عدم تحفظ معاشرے میں جہاں قانون گھر کی لونڈی ہے۔ ایک خاندان کیلئے سوچنے کی بات ہے کہ وہ اس کیس کو شہرت ملنے کی وجہ سے اگر انصاف پا بھی لیں تو بقیہ بچے اُن با اثر لوگوں سے محفوظ رہیں گے۔

پانچ سالہ معصوم سنبل زیادتی کا نشانہ بنتی ہے۔ مجرموں کو فوری کھوجنے اور سزا دینے کے بجائے ہم چار چشم دید گواہوں اور DNA ٹیسٹ جیسی بحثوں میں الجھ جاتے ہیں۔ واقعے کے عینی شاہد چار گواہ کہاں سے آئیں گے۔ کیا یہ جرم سر بازار ہوا تب بھی ظلم ہوتے ہوئے مجرم کا ہاتھ نہیں پکڑا گیا تو انصاف کیلئے شہادت کی توقع ایسے لوگوں سے تو ایسے ہی ہے جیسے دودھ کی رکھوالی کی توقع بلی سے۔

اب شناخت پریڈ کا کہا جا رہا ہے وہ ہوگی۔ وہ ہنستی مسکراتی بھولی بھالی بچی جو گھر سے آئس کریم لینے نکلی تھی۔ کیا اُسے اس سانحے کی توقع تھی۔ ایسا حادثہ تو اچھے بھلوں کے اوسان خطا کر دیتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خبر پڑھتے ہوئے آپ کا اندر باہر یکدم سناٹے میں آجاتا ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور شدید غصے اور دُکھ کی کیفیات آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں تو ایسے حادثے کا شکار ہونے والا فرد اپنے ہوش و حواس قائم رکھے اور وہ بھی معصوم بچی۔

مجھے بہت پہلے کا وقوع ہونے والا ایک حادثہ یاد آیا ہے کہ جنوبی پنجاب کے کسی گاؤں میں پچیس سالہ خاتون کو اندھیری رات میں ریپ کیا گیا۔ عورت کے منہ پر کپڑا باندھا گیا تھا۔ ناک کھلی رہی۔ اُس جسم کی مخصوص بو اس کے اندر کہیں اتر گئی۔ اور پورے دس سال بعد اُسی مخصوص بو کو اپنے کسی عزیز کے وجود سے محسوس ہونے پر اُس نے چھری اُس کے پیٹ میں اتار دی تھی۔ یہ ایک ذمہ دار عورت کا معاملہ تھا۔ بچی سے شناخت کی توقع جس کا منہ اور آنکھیں جانے کیسے بند کی ہوں گی۔ اب یہاں ڈی این اے ٹیسٹ موجود ہے۔ جو مجرم کی گرفتاری کروا سکتا ہے۔ اور یہاں ہمارے علماء اور آئینی ادارے کونسل اف اسلامک آئیڈیالوجی کا ارشاد کہ اس ٹیسٹ کی عینی شاہدوں کے مقابلے پر کوئی اہمیت نہیں۔

اب معاملہ ایسی فروعی بحثوں میں الجھتا اور لٹکتا جائے گا۔ ہم آخر اجتہاد کی اہمیت کو کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلامی قوانین کا اطلاق جن حالات اور زمانے میں

تھا۔گزرتے وقت اورعصری تبدیلیاں ان قوانین میں تبدیلیوں کی متقضی ہے اس ضمن میں امام ابوحنیفہ کی مثال دی جاسکتی ہے کہ اپنے ہمہ وقت لوگوں سے رابطے کی وجہ سے وہ عام لوگوں کے مسائل سے اگاہ رہتے تھے اور شرعی قوانین میں اپنی مجلس مشاورت کی مدد اور رائے سے تبدیلیاں کرتے تھے۔موجودہ حالات میں ڈی این اے ٹیسٹ سے معتبر کوئی گواہی نہیں جو مجرم کو پکڑ سکے اور اسے تختہ دار پر لائے۔

معصوم بچے لڑکیاں اورلڑکے دونوں ایسے وحشی انسانوں کا نشانہ بنتے ہیں۔جو زیادتی کے بعد ان کے گلے گھونٹ کر کہیں کھیتوں میں، کہیں ویران کنوؤں ،کہیں چھپڑوں، کہیں نہروں میں پھینک دیتے ہیں۔کہیں گاؤں کے زمیندار کا بیٹا مرکزی کردار ادا کررہا ہے۔کہیں گھر کی ملازمہ کے ساتھ صاحب خانہ کی زیادتی اور بچی کا قتل۔ہمارے معاشرے کی بے حسی سامنے آتی ہے۔

صبح اخبار کھولیں پانچ چھ کیس تو معمول کی بات ہے۔ابھی دیہی علاقوں میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات میڈیا پر اکثریوں نمایاں نہیں ہوتے ہیں جیسے بڑے شہروں اوران کی مضافاتی بستیوں میں میڈیا کے ہتھے چڑھ جانے والے واقعات شہرت پکڑ لیتے ہیں۔

کمزور اور غریب کی تو ایف آئی ار نہیں کٹتی۔تھانے میں وہ فریاد لے کر جاتا ہے تو کہیں اس کی سنوائی نہیں۔مجرم اگر یہ جان لے کہ پکڑے جانے پر اُس کا گاٹا اتر جانا ہے تو دیکھیں وہ غلط کام کرنے سے پہلے بیس بار سوچے گا۔جرائم دنیا کے کونسے کونے میں نہیں۔دنیائے اول ہو دوم ہو یا سوم۔انسانی فطرت خیر اور شر دونوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔مگر قانون کی سخت گرفت ہاتھ باندھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ہمارے یہاں کتنی این جی اوز ہیں جو ڈھیروں ڈھیر غیر ملکی فنڈ زلیتی ہیں۔ان کی شاندار عمارات اور اُن میں موجود سہولیات دیکھ کر آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔کارکردگی کا حال رپوٹیں بنانا، پیپر ورک اور عملی کام صفر۔میکانزم نہیں،کوئی چائلڈ پروٹیکشن پالیسی نہیں۔

گلیوں بازاروں میں پھرتے یہ بچے اِن انسان نما بھیڑیوں کے ہتھے یوں آسانی سے چڑھتے ہیں۔پاکستان میں تقریباً 85 لاکھ بچے بنیادی تعلیم سے محروم ہیں۔غریب لوگوں کی ایک تعداد دینی مدرسوں میں بھی جاتی ہے۔جہاں کا گھٹن زدہ روایتی ڈنڈا پرور ماحول اس پر تنگ نظر اُستاد جنکے چھوٹے تنگ نظر ذہن اکثر بچوں کو غلط راستوں پر چلانے کا باعث بنتے ہیں۔

ایک مرنا ہمارے بے لگام ٹی وی چینلو کا ہے۔مار دھاڑ والی فلمیں۔چھوٹے بچے جو دیکھتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ایک کھلونے بنانے والی کمپنی جنھوں نے بچوں کے ہاتھوں میں پستول اور کلاشنکوفیں پکڑائی ہیں۔گھر میں چار بچے اکٹھے کھیل رہے ہوں تو ڈزڈز گولیاں چلتی ہیں اور ہمارے بچے اسی طرح لیٹ کر مرنے کی ایکٹنگ کرتے ہیں۔ہم کہاں جارہے ہیں؟

ایک بُرا ہوا انٹرنیٹ کا۔ماؤں کو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ بچے اور بچیاں کیا کررہی ہیں۔چیٹنگ میں کسے الّو بنارہی ہیں اور کہاں خود بن رہی ہیں۔خدا ہمارے اوپر رحم کرے۔

24-09-2013 پاکستان

لمحہ فکریہ

جائیں تو جائیں کہاں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

عید کی چھٹیوں کا پتہ چلا۔ایک طرح پورا ہفتہ ہی بن گیا۔چلو شکر اخباروں کو بھی چھٹی ہوگی۔دل جلانے والی خبریں تو نہیں پڑھنے کو ملیں گی۔ٹی وی ہم دیکھتے ہی کم کم ہیں۔اخبار تو نشے کی سی لت رکھتا ہے۔اور جب اخبار دیکھا سارا رنج وغم سے بھرا پڑا تھا۔ڈیرہ اسماعیل خان میں خودکش حملے میں صوبائی وزیر اسرار اللہ گنڈاپور سمیت دس 10 افراد جاں بحق ہو گئے۔یا اللہ گھر سے عید کی نماز کیلئے نکلتے وقت معلوم تھا کیا کہ پلٹ کر آنا نصیب نہ ہوگا۔بچے اور گھر والے تو انتظار میں ہوں گے۔خوشیوں سے بھرا گھر پلک جھپکتے میں ماتم کدہ بن گیا۔

اگلے صفحے پر ماضی کی مقبول فنکارہ انجمن کی رنج وغم میں ڈوبی تصویر نے تڑپا دیا۔لفظ جیسے نیزے کی انی کی طرح اندر اُتر گئے تھے۔ہم باہر کے ملکوں میں شیشوں کے گھروں میں بھی محفوظ ہیں۔اور پاکستان میں بلندو بالا قلعہ نما گھروں اور فصیلوں کے اندر بھی نہیں۔پاکستان نے میرا اور میرے بچوں کا گھر اجاڑ دیا۔بائیس سالہ بیٹی ہسپتال میں پڑی تھی۔سابقہ یا بقول اس کے موجودہ شوہر دنیا سے رخصت ہوا پڑا تھا۔

ہائے ری میّا پاکستان تو کبھی ایسا نہ تھا۔یہ تو امن اور عافیت کا گہوارہ تھا۔اسے کسی کی نظر کھا گئی۔

آگے چلتی ہوں افغانستان میں مجاہدین کے حملے میں چھ افغان فوجی ،پانچ امریکی ،عورت اور چار بچے ہلاک۔افغانستان کی تصویریں آنکھوں کے سامنے ابھرتی چلی آئیں۔آگ کے بلندو بالا پہاڑ۔خون میں لتھڑی لاشیں۔لڑکیوں کے بارود سے اڑتے سکولوں کی ڈھیر ہوتی عمارات۔اے پروردگار ظاہر شاہ کے زمانے کا داؤد کے زمانے کا یہ 1960 کی دہائی کا افغانستان کیسا ہنستا بستا نظر آتا تھا۔کالجوں یونیورسٹیوں میں پڑھتی لڑکیوں سے شاد آباد۔پر رونق شہروں سے جگمگاتا ،وسط ایشیا کے لوگوں سے ہند چینی سے جانے والوں ،سیاحوں اور تاجروں سے بھرا پڑا۔گہما گہمی سے لدا پھندا۔اس کے دن روشن اور راتیں حسین تھیں۔اسے کس کی بد دعا لگی کہ رونقوں پر جھاڑو پھر گیا۔اور چمکتے دنوں میں بھی شہروں میں اُلّو بولنے لگے۔

یہی تصویر عراق میں تھی۔بارود سے بھری گاڑیوں نے حملوں سے 61 جانیں لیں۔اور کوئی 2000 کے قریب زخمی کیے۔صدام آمر تھا،ڈکٹیٹر تھا۔مگر اُس نے ڈنڈے کے زور پر عرب اور کرد نسل پرستی کے منہ زور گھوڑے کی طنابیں کسی ہوئی تھیں۔شیعوں اور سُنیوں کو نتھ ڈالی ہوئی تھی۔تعلیمی ادارے بہترین ،اسپتال شاندار ،امن وسکون۔اور اب؟ ملک داؤ پر لگا ہوا ہے۔یہی کچھ شام کے ساتھ ہو رہا ہے۔جھڑپیں اور دھماکے۔فوج کا اعلیٰ جنرل اور چوالیس ہلاک اور سینکڑوں زخمی۔میرے اللہ شام اتنا خوبصورت ملک کیا حلب ،کیا حمص اور کیا دمشق شہر کے نگینے جڑے ہوئے تہذیب وتمدن کے بھاری اثاثے اپنی پشت پر اٹھائے۔میرے اللہ اُن کشادہ گلیوں میں چلتے ٹینک تو پیں کیسے اُس کا حسن روند رہی ہیں۔میں نے اخبار بند کر دیا آنکھیں موندلیں۔

مصر کی سڑکوں پر بہتا خون تحریر سکوائر میں بچھی لاشیں ،جیلوں کی آہنی سلاخوں کے اندر زبردستی دھکیلے گئے انسانوں کے پرے۔جمہوریت پر یہ شب خون اس پر مزید ستم کہ ڈکٹیر مصری حکومت نے غزہ سے ملحق وہ راستہ بند کیا ہوا ہے جس کے ٹرمنل گیٹ کے سامنے بیسیوں فلسطینی افراد چھوٹے بچوں کے ساتھ راستہ کھلنے کے انتظار میں ہفتے سے انتظار کی صلیب پر چڑھے بیٹھے ہیں۔اسلامی ملکوں کے ڈکٹیٹر اور آمران بڑے ملکوں کو بہت کھلتے ہیں۔عراق ،لیبیا ،تیونس اور مصر بیرونی پشت پناہی پر ان عرب انقلابی تحریکوں نے اپنے اپنے ملکوں سے ڈکٹیٹروں کو تو ہٹا دیا۔صدام حسین ،قذافی ،زین العابدین اور حسنی مبارک۔مگر کیا اِن ملکوں کو بہتر قائد نصیب ہوئے۔اب شام میں جو کچھ ہو رہا ہے۔عراق میں انارکی ،افراتفری ،قتل وغارت اور فرقہ واریت اپنے عروج پر ہے۔ایسے میں بہار عرب کی شان میں قصیدے پڑھنا

کچھ مناسب نہیں ۔

یوں عرب بادشاہتیں ابھی تک خوفزدگی میں ہیں ۔سعودی عرب کو کیا کہیے جوامریکہ سے سردمہری اور کھچاؤ کی سی حالت میں ہے کہ اُس نے ایران اور شام کے خلاف باقاعدہ جنگ نہیں کی ۔ان کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجائی ۔ان کی نسلیں تباہ نہیں کیں ۔کتنی بیتابی اور شتابی ہے ۔گھبراتے کیوں ہیں؟ اُس کے پروگرام تو میں پورے عالم اسلام کا تیاپانچہ ہے ۔بہارعرب اب آگے کس کس کیلئے خزاں عرب بنتی ہے ۔

اب چند لمحوں کیلئے اگر یہ جاننے کی کوشش کریں اس آگ کو پیدا کرنے ،بھڑکانے اور تماشے دیکھنے والے کہاں ہیں جارج ڈبلیو بش ،ٹونی بلیر ،ڈک چینی ،ڈونلڈ رمزفلیڈ ،کولن پاول اور ہمارے اپنے چہیتے جنہوں نے اس آگ کو جلنے اور تیل ڈالنے کے سامان مہیا کیے وہ سب اپنی اپنی آرام دہ کچھاروں میں مزے لوٹ رہے ہیں ۔مراعات یافتہ زندگیاں گزار رہے ہیں ۔یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتے ،کتابیں لکھتے اور ڈالر بناتے ہیں ۔اگر شومئی قسمت سے ہمارے جیسے ملک کا سرکردہ بندہ کہیں مشکل میں پھنس گیا تو کیا غم ۔چند ماہ کا جبراً آرام اور عیش ہی سہی ۔کونسا گلے میں پھندہ لٹکنا ہے سب طرف خیر ہی خیر ۔سمجھوتے اور راز ائیں ۔

اب ہمارے جیسے عام لوگ بیچارے کیا کریں ۔کہاں جائیں؟ انہیں تو یہیں رہنا ہے ۔کیسا ستم ہے اُن ماؤں کیلئے جو اپنے بچوں کو مسجد میں جا کر نماز ادا کرنے کی تاکید کرتی تھیں ۔مجھے یاد ہے میں ہمیشہ سے اپنے بیٹوں کو نماز جمعہ کیلئے بھیجنے کا خصوصی اہتمام کیا کرتی تھی ۔اگر کوئی سستی کرتا تو لعن طعن کے ساتھ باقاعدہ ناراض ہوتی ۔مگر کیسا وقت آ گیا ہے کہ میں بظاہر لبوں کو سیئے انہیں اور ان کے بیٹوں کو نماز جمعہ کیلئے تیار ہوتے دیکھتی ہوں میرا اندر چاہتا ہے اُن سے کہوں کہ مت جاؤ ۔ڈر لگتا ہے ۔پھر رک جاتی ہوں ۔دل ہی دل میں دعائیں مانگتی ہوں ۔

کس سے پوچھیں ۔طالبان سے ۔جو وارداتوں کے بعد اپنی پوزیشن واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کے اعصاب پر وہ ننھی سی لڑکی ملالہ سوار رہتی ہے ۔یا ارباب اختیار سے جو ایسے ہر حادثے پر مذمتی بیان دے کر فی کس لاکھ ،دو لاکھ بخشش کا اعلان کر کے فارغ ہو جاتے ہیں ۔کیا یہ حقیری رقم اُس جان کا معاوضہ ہو سکتی ہے جو اگر اپنے خاندان کا سربراہ ہے تو اُس کی ایک ذات سے کتنی جانیں لپٹی ہوئی ہیں ۔اور اگر وہ اپنے گھر کا اکلوتا روشن چراغ ہے تو اس کے بغیر ماں اندھی ہو جاتی ہے ۔

قانون پتہ نہیں کہاں ہے؟ اور نافذ کرنے والے پتہ نہیں کن اہم کاموں میں مصروف ہیں ۔

کسے آواز دیں اور کسے پکاریں ۔

پاکستان 25-10-2013

لمحہ فکریہ

آیئے تھوڑی دیر ہنسیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

لدھیانے کی مایہ ناز شخصیت ڈاکٹر کیول دھیر کے ساتھ اس بار دلّی سے کے ایل نارنگ ساقی بھی چوتھی عالمی ادبی کانفرنس میں شرکت کیلئے لاہور آئے۔ ادبی کانفرنس کا دلچسپ احوال انشاءاللہ اگلے کالم میں لکھوں گی۔ کے ایل نارنگ ساقی بہت محبت اور پیار کرنے والے انسان ہیں۔ لاہور میں اُن کی دوسری کتاب ''قلم کاروں کی خوش کلامیاں'' شائع ہوئی تھی۔ جسے پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمارے ادب اور ہمارے لوگوں کو ایسی کتابوں کی بھی شدید ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کے ایل نارنگ ساقی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ایک کٹھن کام کا انہوں نے بیڑہ اٹھالیا ہے۔ آج کے زمانے میں جب گھٹن، ڈپریشن، معاشی مسائل کے انبار کے ساتھ ساتھ امن اور سکون بھی داؤ پر لگے ہوئے ہوں۔ خیر اور امید کی کوئی خوشگوار خبر اخباروں اور چینلز کے ہجوم میں سے تلاش کرنی پڑتی ہے تو کوئی ایسی کتاب جو آپ سے جارج ایچ پاول کے الفاظ میں کہے۔ What is the use of worring

Pack up your troubles and worries in your old kit bag and smile smile smile

اور واقعی آپ کے ہونٹ مسکرا اٹھیں۔ کہیں آپ بے اختیار قہقہ لگانے پر مجبور ہو جائیں تو یقیناً کاوش کرنے والا آپ کی محبتوں اور دعاؤں کا مستحق ہے کہ اللہ کے نزدیک بہت پسندیدہ اور پیارا ہے کہ اُس کی مخلوق کو خوش کر رہا ہے۔ ہنسا رہا ہے۔

نارنگ ساقی سے غائبانہ تعارف تو پرانا ہے کہ ہم تخلیق کے باقاعدہ قاری اور لکھاری ہیں مگر بالمشافہ تعارف رات بُشری رحمان کی ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں دیئے گئے کھانے پر ہوا۔

دھیمے سے لہجے میں بات کرنے والے نرم خو سے انسان کو دیکھ کر مجھے اپنے تصور میں تراشی ہوئی کے ایل نارنگ کی تصویر میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی تھی۔ دلّی میں پاکستان سے جانے والے نامور ادیبوں اور ہندوستان کے مشہور ادیبوں کیلئے محفلیں سجانے اور ان کی باتوں سے مزاح، لطیفہ کوئی بذلہ سنجی کے موتی چننے اور روقت کی گزری تہوں سے اِن گوہروں کو ڈھونڈ نکالنے والا تو یہ بالکل اپنا اپنا سا نظر آنے والا شخص ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ''قلم کاروں کی خوش کلامیاں'' ایسی کتاب نہیں ہے کہ جسے ایک بار پڑھنے کے بعد آپ کہیں ریک پر سجادیں۔ یہ اُن کتابوں میں سے ہے جنہیں ہمیشہ بیڈ کے سرہانے رکھا جاتا ہے جب آپ اداس ہوں آپ اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیں۔ آپ کی اداسی بھاگ جائے گی۔ اس لیئے بھی کہ ادب کی یہ لیجنڈری شخصیات ہمیشہ انسان کو آسمان پر چمکتے ستاروں کی مانند نظر آتی ہیں۔ ان کی روزمرہ کی باتوں سے چھلکتی مزاح کی لطافتیں بذلہ سنجیاں نکتہ آفرینیاں بتاتی ہیں کہ وہ بھی ہم جیسے ہی انسان ہیں۔ انسانی فطرت کے تقاضوں اور ان کی جبلتوں میں گندھے ہوئے۔

اردو ادب نارنگ ساقی کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے بڑے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی باتوں کو محفوظ کر دیا ہے۔

پاکستان میں جو مزاح تخلیق ہو رہا ہے اُسے محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ بشری رحمٰن، عطاءالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، جیسے ملک کی لیجنڈری شخصیات۔ جب کسی محفل میں اکٹھی ہو جائیں تو وہ پھلجڑیاں چھوٹتی ہیں کہ آنکھوں کے کنارے نم نہیں باقاعدہ بھیگ جاتے ہیں۔ بشری رحمٰن جیسی ادبی خاتون نے تو سیاسی میدان میں بھی مزاح کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ مرحوم دلدار پرویز بھٹی جو ایک پیدائشی فنکار تھا۔ اُسکے لطائف ڈھیروں ڈھیر ہیں۔

ایک عدد نارنگ ساقی کی پاکستان کو بھی اشد ضرورت ہے کہ ماشاءاللہ مواد کثرت سے ہے۔ بس نارنگ ساقی جیسے جوش و جذبے کی ضرورت ہے۔

سرحد پار کے اس مہمان کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے اتنی خوبصورت کتاب پڑھنے کو دی۔لیجیے آپ بھی تھوڑی دیر کیلئے ہنسیں۔

امجد اسلام امجد کا سریل ''وارث'' ٹی وی پر چل رہا تھا۔اس کے ٹائٹل سین میں کتے چلتے ہوئے دکھائے جاتے تھے۔اس کے ساتھ ہی رائٹر کا نام امجد اسلام امجد دکھایا جاتا تھا۔عطاء الحق قاسمی نے فون پر امجد سے کہا۔''یار کمال ہے آج تک کسی سریل والے نے رائٹر کی تصویر نہیں دکھائی لیکن تمہارے سریل والے تو رائٹر کی تصویر بھی ساتھ دکھا رہے ہیں۔''

ضمیر جعفری جن دنوں سٹیلائٹ ٹاؤن میں رہتے تھے۔ایک جیسے مکانوں کے نقشے کی وجہ سے ایک شام بھول کر کسی اور دروازے پر دستک دے بیٹھے۔دروازہ کھلنے پر دوسری عورت کو دیکھ کر جعفری صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔فوراً واپس پلٹے۔اس فعل کا ذکر جب جعفری صاحب نے ایک دوست سے کیا تو اس نے سوال کیا:

''جعفری صاحب،آپ کو غلط گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے پر شرمندگی نہیں ہوئی کیا؟''

''مجھے اس فعل پر کوئی شرمندگی نہیں ہوئی،لیکن یہ دیکھ کر ضرور تکلیف ہوئی کہ دروازہ کھولنے والی عورت میری بیوی سے بھی زیادہ بدصورت تھی۔''جعفری صاحب نے جواب دیا۔علی سردار جعفری اور سلطانہ دونوں ہی لکھنو یونیورسٹی میں الگ الگ شعبے میں ایم اے کر رہے تھے۔سردار جعفری نے پہلی ملاقات میں سلطانہ سے کہا''تم تو وینس ڈی میلو'' ہو۔چند روز بعد سلطانہ نے انہیں وینس ڈی میلو کا مجسمہ تحفتاً دیا۔اس پر سردار جعفری نے کہا ''کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں۔''

مجتبیٰ حسین،حمایت اللہ،طالب خوندمیری،اور مصطفیٰ علی بیگ طنز و مزاح کی ایک محفل میں شرکت کیلئے سعودی عرب گئے،وہاں پہنچتے ہی عمرہ کی ادائیگی کیلئے مکہ مکرمہ چلے گئے۔خانہ کعبہ میں سب لوگ نماز ادا کر رہے تھے کہ حمایت اللہ سے ایک صاحب نے پوچھا ''قبلہ یہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟''حمایت اللہ نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا'' کچھ تو خیال کیجیے یہ خانہ کعبہ ہے۔''وہ اٹھ کر پچھلی صف میں مصطفیٰ علی بیگ کے پاس بیٹھ گئے۔جیسے ہی دعا ختم ہوئی تو انہوں نے مصطفیٰ سے پوچھا یہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟مصطفیٰ نے بھاؤ بتاتے ہوئے کہا''جناب یہ اللہ کا گھر ہے یہاں دنیاوی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔اس پر انہوں نے پوچھ کہ آپ کو بھاؤ کیسے پتہ چلا؟بیگ نے جواب دیا میں نے ایرپورٹ پر اترتے ہی سونے کا بھاؤ پوچھ لیا تھا تا کہ خانہ کعبہ میں لوگوں سے ایسے بیہودہ سوال نہ کرنے پڑے۔

سریندر پرکاش نے صدر پاکستان ضیاءالحق کو خط لکھا۔''میں اپنے آبائی وطن لائل پور کو ایک دفعہ دیکھنا چاہتا ہوں۔لہذا مجھے پاکستان آنے کی اجازت دی جائے۔اجازت تو کیا ملتی البتہ پولیس گھر پر ضرور پہنچ گئی اور اسے پوچھا۔تم بغیر پاسپورٹ،ویزا کے پاکستان کیسے جاسکتے ہو؟اسی لئے تو میں نے سیدھے صدر پاکستان کو خط لکھا تھا کہ پاسپورٹ اور ویزا کی رسمی کاروائی سے مستثنٰی کردیا جاؤں'سریندر پرکاش نے معصومیت سے جواب دیا۔

ایک پاکستانی ادیب ہندوستان آئے تو واجدہ تبسم سے ملاقات میں کہنے لگے۔آل احمد سرور پاکستان آئے تھے،ان سے پوچھا گیا واجدہ تبسم آپ کے خیال میں کیسی افسانہ نگار ہیں؟اس پر انہوں نے کہا واجدہ تبسم کون ہیں؟یہ واقعہ سنا کر انہوں نے ازراہ مذاق واجدہ سے پوچھا کیا یہ ممکن ہے کہ آل احمد سرور نے آپ کے بارے میں یہ کہا ہو؟واجدہ تبسّم نے آنکھوں میں حیرت بھر کر مخاطب کو دیکھا اور پھر معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا یہ آل احمد سرور کون ہیں؟

پشتو کے شاعر پریشان خٹک اردو بہت اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔انھوں نے کالج میں سروس شروع کی تو وہاں ایک لیکچرر خاتون بھی تھیں۔وہ بہت عرصے تک انھیں ''قبلی،قبلی'' کہہ کر پکارتا رہا۔ایک دن اس خاتون نے غصّے سے انہیں پوچھا۔'' آپ مجھے ہر وقت ''قبلی قبلی'' کیوں کہتے ہیں؟''''مرد حضرات کو احترام سے قبلہ کہتے ہیں،تو عورتوں کو یقیناً ''قبلی'' کہتے ہوں گے۔''پریشان خٹک نے انکساری سے جواب دیا۔

روس پر جیت حاصل کرنے کے بعد نپولین کو ایک بوڑھی عورت نے پوچھا''یہ بات ٹھیک ہے کہ فرانسیسی لوگ زمین،دولت اور عورت کیلئے لڑتے ہیں؟مگر ہم روسی لوگ ایسے نہیں۔اگر ہم لڑتے ہیں تو صرف اپنی خودداری کیلئے ہی لڑتے ہیں۔نپولین کے محافظوں نے تلواریں نکال لیں۔مگر نپولین نے سب کو منع کردیا۔ایک بھرپور مسکان کے ساتھ اس نے بزرگ عورت کی طرف دیکھا اور کہا''محترمہ!آپ نے جو کہا وہ بالکل درست ہے۔ہر کوئی اس چیز کیلئے ہی لڑتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔''مضمون ادبی بیٹھک الحمرہ میں پڑھا گیا۔

پاکستان 30-11-2013

لمحہ فکریہ

ادبی اور ثقافتی تقریبات انتہاپسندی کے خاتمے کیلئے اہم ہیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

میرے بچپن میں ہمارے گھر کے سامنے واقع میدان میں ہر سال آتی سردیوں کی رتوں میں کسی پیر کے عرس کے نام پر ایک میلہ لگتا تھا۔ ہفتے کی رات کو قوالیاں ہوتیں اور دن میں تقریریں اور لنگر بٹتا۔ ایسی رونق ایسا میلہ۔ ہم بچے ساری رات جاگتے۔ سارا دن کدکڑے لگاتے، کھانے پینے کی چیزوں پر لوٹ مار کرتے۔ میلے کے انعقاد کی خبر سنتے ہی ہمارے رگ و پے میں وہ مسرت دوڑتی کہ زمانے گزر جانے پر آج بھی اُسکی سرشاری محسوس ہوتی ہے۔ اِس تمہید کو باندھنے کا مقصد چوتھی عالمی اردو کانفرنس کے بارے آپ سے کچھ باتیں کرنا تھیں۔ دو ماہ قبل ہی اس کے چرچے شروع ہو گئے تھے۔ بیرونی ممالک سے کون کون آ رہے ہیں؟ ہندوستان سے کن کن کے نام ہیں؟ ٹیلی فونوں اور موبائلوں پر ممکنہ ناموں اور دیگر باتوں پر بحث ہوتی۔

کتاب کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کا دُکھڑا اظہار ہم ادیب ہر محفل میں کرتے ہیں اور اس پر رائے زنی بھی ہوتی ہے کہ دراصل ہمارے ہاں تعلیم کی چونکہ بہت کمی ہے۔ کتاب پڑھنے کا رجحان پہلے ہی اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ایسے میں انٹرنیٹ کے طوفان نے ہم جیسی ہوچھی جٹ قوم کو بے قابو کر دیا ہے۔ وگرنہ تو علم کے زیور سے رچی بچی قومیں اُسی طرح کتاب اور حرف سے محبت کرتی ہیں۔ ان کے ہاتھ آج بھی کتاب کو پکڑے ہوئے ہیں۔ بسوں میں، گاڑیوں میں، بس سٹاپوں پر ہر جگہ رسالہ کتاب کھلنا ضروری ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں اٹھارہ کروڑ کی آبادی والے ملک میں ایک ہزار کتاب کا ختم ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔

سہ روزہ ادبی و ثقافتی کانفرنس کا پروگرام جب سامنے آیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا کہ ادب، تصوف، آرٹ، تھیٹر اور میڈیا کو کس خوبصورتی سے ایک چھت تلے اکٹھے کر دیا اور ہر شعبے کے ماہرین کو دعوت دے ڈالی۔

افتتاحی سیشن کی صدارت وزیراعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف نے کی۔ عطاالحق قاسمی اور ان کے ساتھی الحمرا میں جم خانہ طرز کا ایک خوبصورت کلب بنانے کی خواہش کو پالے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ بڑا کام ان کے ہاتھوں سرانجام پا جائے۔ دوسرے ادیبوں کی فلاح و بہبود سے متعلق بہت سے پروگرام بھی انکی ترجیحات میں ہیں۔ یہ سیشن بڑا بھرپور تھا۔ مصر، بنگلہ دیش، برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور ہندوستان سے آنے والے مندوبین نے باتیں کیں۔ وزیراعظم نے انڈیا ٹائمز کے ایڈیٹر کنگ سنگھ ناگ سے بھی اپنی تقریر میں مخاطب کرتے ہوئے دونوں ملکوں کے درمیان امن اور مفاہمت پر زور دیا۔ اور یہ بھی کہا کہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی بحالی میں میڈیا کا بہت اہم رول ہے۔ ہندوستان کے کردار کے حوالے سے بھی بات ہوئی کہ وہاں پڑوسیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کیلئے وہ گرمجوشی نہیں پائی جاتی ہے جس کا اظہار کم و بیش پاکستان میں ہوتا ہے۔

انہوں نے دہشت گردی کے حوالے سے بھی کافی باتیں کیں۔ اگلے دنوں کے سیشن بڑے بھرپور تھے۔ ہر سیشن میں جوانوں اور بوڑھوں کی تعداد دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے لوگ ترسے ہوئے ہیں۔ سُننا چاہتے ہیں۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ سیڑھیوں پر بھی قبضہ ہوتا۔

یہ یاس اور ناامیدیوں سے بھرے دنوں میں بڑی خوش آئند اور امید افزا بات لگتی تھی۔

ہندوستان میں اردو کی بات ہو یا پاکستان میں افسوس۔ تقریب میں نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین تشریف نہیں لا سکے۔ وہ بہت حد تک ہندوستان میں اردو کے احوال پر روشنی ڈال سکتے تھے اُس سے صحیح صورت سامنے آتی۔ پر بات تو یہ ہے کہ پاکستان میں اردو کا مستقبل کون سا روشن ہے۔ ابھی بنگلہ دیش میں سارک کانفرنس ہو رہی تھی۔ پتہ چلا کہ انہوں نے اردو لکھاریوں کی بجائے انگریزی ادیبوں کو بلایا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسلامی ثقافت کو علامہ اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی ثقافت سے علامہ کی مراد آمریت کی بجائے جمہوری نظام ہے۔

ناہید صدیقی کے خوبصورت رقص اور محفل موسیقی نے جس طرح ذہنی تواضع کی وہ بھی اپنی جگہ بہت اہم تھا۔ کلاسیکل اور جدید موسیقی کا سیشن دلچسپ ترین تھا۔ ڈاکٹر عمر عادل جیسی ہمہ جہت شخصیت تھی اور بات سے بات نکلنے والی کیفیت۔ علم موسیقی کے سمندر میں وہ ہاتھ ڈالتے اور گوہر نکال نکال کر سامعین کی طرف اچھالتے جاتے۔ جی چاہتا تھا کہ وقت تو کہیں تھم جائے۔

مشاعرے میں پورا لاہور امنڈ آیا تھا۔ ہر شاعر کی خواہش تھی کہ اُسے موقع ملے۔ بہر حال ستر (۷۰) پچھتر (۷۵) تو نپٹے ہی۔ رات کوئی پونے دو بجے تک محفل عروج پہ رہی۔

وزیر اعظم صاحب نے دو کروڑ روپے کی رقم عنایت کی۔ ادیبوں کی فلاح و بہبود سے متعلق بہت سے منصوبے اور کلب اس رقم سے تکمیل پائیں گے۔
وفاقی حکومت کو وفاقی اداروں کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اکیڈمی آف لیٹرز اور مقتدرہ قومی زبان کی طرف وزیر اعظم تھوڑی سی توجہ دے دیں تو بہتوں کا بھلا ہو جائیگا کہ ان اداروں کا جو پتلا حال ہوا پڑا ہے۔ کمروں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اور کام کیا ہو رہا ہے کوئی کچھ نہیں جانتا۔

اس کانفرنس کا دلچسپ ترین سیشن امن کی آشا اور میڈیا تھا۔ میڈیا کے بھی نامور صحافی نجم سیٹھی، مجیب الرحمٰن شامی سے لے کر اوریا مقبول جان، سجاد میر محمود شام اور ہندوستانی جرنلسٹ بیٹھے تھے۔ اوریا مقبول جان اعدو شمار کے ساتھ میدان جنگ میں آستینیں چڑھا کر اُترے اور افتخار احمد کے دلائل پر کشتوں کے پشتے لگائے۔ سلیم صافی نے اوریا جان کو سوالوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ بہر حال بہت لطف آیا۔ ہاں جب انڈیا کے معصوم مراد آبادی آئے اور انھوں نے ہندوستان کی تصویر کھینچی تو یو یار لوگوں سے رہا ہی نہ گیا۔ چلائے۔ یہ تو گھر سے گھر تک کی تصویریں ہیں۔

عطاالحق قاسمی خدا آپ کو صحت اور تندرستی دے آپ نے ایسا خوبصورت میلہ سجایا کہ جی خوش ہوا۔ بہت کچھ سیکھا۔ بہت سے لوگوں سے ملنا ہوا۔ جو عام حالات میں ممکن ہی نہیں۔ ایسی صحت مندانہ سرگرمیوں کا انعقاد انشاءاللہ ذہنوں کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ دہشت گردی جیسی خرابیوں کا بھی توڑ ہیں۔

پاکستان 09-12-2013

لمحہ فکریہ

آیئے ایک شمع عبدالقادر ملا کیلئے جلائیں

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

تو بالآخر حسینہ واجد نے وہ کام کرلیا جس کیلئے اس کا اضطراب اُسے نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا اور وقت کا چناؤ کونسا کیا دسمبر کا جو بہر حال ہماری دکھتی رگ ہے۔ جو ہمیں بہت کچھ یاد دلانے کے ساتھ ساتھ ہمیں رُلاتا بھی ہے۔ اب ہماری حکومت کا طرز عمل ملاحظہ ہو کہ ایک لفظ بھی مذمت کا جواُن کے لبوں سے نکلا ہو۔ کچھ کہا بھی تو بس یہی کہ یہ تو بنگلہ دیش کا داخلی معاملہ ہے۔

سوال تو اتنا سا ہے کہ دار پر چڑھنے والے کا جرم کیا تھا؟ پاکستان سے محبت۔ پاکستان کو متحدہ رکھنے کی تمنا میں اُس کی فوج کا ساتھ دینے کی مجاہدانہ کوشش۔ کاش ہم اتنے کمزور نہ ہوتے۔ کاش ہمارا ایمان اتنا مظبوط ہوتا کہ ہم بھرپور طریقے سے اگر پھانسی کو رُکوا نہ سکتے تو کم از کم اپنا احتجاجی ریکارڈ تو درج کرواتے۔

آپ ذرا 1965 کی جنگ کے بعد کے مشرقی پاکستان کی تصویر دیکھیے جب علیحدگی کی تحریکیں مختلف صورتوں میں خاص ذہنوں سے اُتر کر عوامی رنگوں میں لپٹ کر سلو پوائزننگ کی طرح عام آدمی کے قلب و دماغ کو متاثر کر رہی تھیں۔ ایسے میں با آواز بلند یہ کہنا کہ علیحدگی تو کسی مسئلے کا حل نہیں۔ شکایات ہمیں ہیں۔ بھائیوں کی طرح بیٹھ کر انہیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔

1969 اور 1970 میرا پورا پورا پاکستان میں گزرا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سیاست کا گڑھ تھی۔ طلبہ کہیں ماؤ نواز، کہیں روس نواز، کہیں پروانڈیا تنظیموں میں بٹے ہوئے علیحدگی کے کھلے عام نعرے لگاتے تھے۔ ایسے میں جماعت اسلامی اور اسلامی چھاترو شنگھو کے وہ طلبہ جنہیں پچھمی پاکستان سے محبت اور ابو اعلیٰ سے پیار تھا۔ آپ کو اپنے دل کے کتنے قریب محسوس ہوتے تھے۔ ان کے گھروں میں ایک مختلف کلچر اور مختلف طرز تمدن کے باوجود کہیں بیگانگی اور اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ روٹی کھانے، لسی پینے اور شلوار قمیض پہننے والوں سے محبت کرتے تھے۔ مجھے وہ دو لڑکیاں کبھی نہیں بھولتیں۔ ایک نے ڈھاکہ یونیوسٹی کے انتخابات میں جب کسی نجومی کی پیشگوئی کے مطابق آنے والے وزیر اعظم کا نام الف سے شروع ہوگا پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔ ابو اعلیٰ بھی تو ہوسکتا ہے۔

اور دوسری میڈیکل کالج میں پڑھنے والی رواتنگ کی روہنگیائی نسل کی افسردہ آنکھوں اور زرد چہرے والی جس نے تڑپا دینے والے لہجے میں کہا تھا۔ مسلمان کا وطنیت کا تصور بہت گھٹیا ہوگیا ہے۔ مایو میرا دیس تھا۔ میرا وطن تھا۔ میرے دادا، پردادا کی ہڈیاں وہیں بنیں اور وہیں سڑیں پر برما کی اشترا کی حکومت کی سختیوں نے ہمیں دیس بدر ہونے پر مجبور کردیا۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دامن میں پناہ گزین ہوکر محفوظ ہوگئے ہیں مگر یہاں آکر ہمیں احساس ہوا ہے کہ ہم نے غلط جگہ چنی ہے۔ تم بتاؤ ہم کہاں جائیں؟ مسلمان کیلئے کون سا گوشہ عافیت رہ گیا ہے۔ یہ سوال تنتالیس (۴۳) سال بعد آج بھی میرے سامنے ہے۔ بلکہ زیادہ المناک شدت سے ہے۔

آپ لاکھ جماعت اسلامی سے اختلاف رکھتے ہوں، آپ کو ان کی رخ بدلتی پالیسیوں سے اختلاف ہو مگر وہ لمحہ آپ کیلئے جذباتی طور پر بہت طمانیت لیے ہوئے ہوتا تھا۔

تو یہی وہ جیالے تھے البدر و الشمس کے نوجوان جنہوں نے بنگلہ بولنے والی مکتی باہنی کے خلاف آواز بلند کی کہ وہ غیر بنگالیوں کا قتل عام بند کریں۔ اور پھر حالات کے بے قابو ہوجانے پر ہر محاذ پر پاک فوج کیلئے رہبر و رہنما بنے اور دفاع وطن کی شمع پر پروانوں کی طرح نثار ہوئے۔ لیکن ہمارے پاس انہیں خراج تحسین پیش کرنے کیلئے دو لفظ نہیں۔

ہمارے آج کے بچے جانتے ہی نہیں کہ یہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے نظریہ پاکستان کیلئے اپنی جوانیاں قربان کردی تھیں۔

سچ تو یہ ہے کہ عبدالقادر ملاّ کو پھانسی کی خبر ایک بجلی بن کر حساس پاکستانیوں کے دل پر گری ہے۔ان میں سے غالبًا کسی کی بھی کبھی کوئی ملاقات اُن سے نہیں ہوئی، نہ کوئی خونی ناطہ ہے اور نہ تعلق۔ مگر وہ تعلق جس پر ہزار رشتے قربان۔

اب جس جنگی جرائم کے ٹریبونل نے انہیں فروری میں عمر قید کی سزا سنائی تھی کورٹ نے اس سزا کو سزائے موت میں تبدیل کر دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے بنائے گئے اِس جنگی ٹریبونل پر انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کی تنظیمیں شدید نکتہ چینی کرتی ہیں۔ان کے اپنے نمائندوں نے حقائق کو جس انداز میں دیکھا اور رپورٹیں بنائیں اور پیش کیں وہ ان سے مختلف ہیں۔اُنکا کہنا ہے کہ ٹریبونل نے جس طرح انصاف کے تقاضوں کی دھجیاں اُڑائی ہیں اُس کی مثال نہیں ملتی۔

حسینہ واجد کی حکومت نے جو کرنا تھا کر لیا مگر اُس مردِ مجاہد کا کردار تو دیکھیے۔ مجھے فیض یاد آ رہا ہے۔میں نے ان کے اشعار کو زیرِ لب دہرایا ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا،

وہ شان سلامت رہتی ہے،

یہ جان تو آنی جانی ہے،

اِس جان کی کوئی بات نہیں۔

اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اُس سچے مسلمان کا یہ کہنا۔میرے لیے آنسو نہیں بہانا اور نہ ہی کوئی فرد رحم کی اپیل کرے۔میں جانتا ہوں میں سیدھے اور سچے راستے پر ہوں۔میری شہادت کے بعد کارکن اشتعال انگیزی نہ کریں۔ بنگلہ دیش کے اندر قانونی اور آہنی طریقے سے اسلام کو پھیلانے اور اس کے نفاذ کی کوشش ہو۔

سبحان اللہ۔

خدا دنوں کو قوموں کے درمیان پھیرتا ہے انشاءاللہ وہ وقت ضرور آئے گا جب ایسے شہدا کی قربانیاں رنگ لائیں گی اور صاحبِ ایمان لوگ اٹھیں گے جو حق اور سچ کا علم

اٹھایں گے۔

خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

17-12-2013 پاکستان

لمحہ فکریہ

چھوٹے میاں جی میں انتظار کروں گی۔

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

نئے سال کا پہلا دن اور ہمارے درمیان میدان کارزار گرم۔آپ سمجھ جایئے ہمارے سے مراد ہم دونوں یعنی میاں بیوی۔اب ستم ہی ہے نا کہ کمرے اندھیرے اور چولہے ٹھنڈے۔گھر میں آگ نہ ہو تو لگتا ہے برکت کہیں اُڑ گئی ہے۔نل کھولیں تو یخ پانی۔وضو کیا خاک کرنا ہے۔منہ دھونے کو جی نہ چاہے۔اوپر سے بڑھاپا جس میں ہڈیاں کوڑے چٹخیں اور جوڑ بولیں تو پھر کام ایک دوسرے سے لڑنا بھڑنا ہی رہ جاتا ہے کہ ''میں نے کہا تھا نا یہ بُرا وقت آنا ہی آنا ہے۔ہمارے حکمرانوں نے ہمیں پتھروں کے زمانے میں پہنچانا ہی پہنچانا ہے۔لان کی خوبصورتی کو گولی مارو اور ایک کونے میں کچا چولہا اور لکڑیوں کا بندوبست رکھو۔

کمہار کا غصہ کھوتے پر ہی نکلتا ہے تو میں نے بھی طیش میں اپنے میرے بھائیوں کو فون کھڑکایا جو بڑے بزنس مین اور میاں صاحبان کے پروانوں میں سے ہیں۔اندر کی پوری بھڑاس کی زہریلی گیس اُن پر چھوڑی اور طعن و تشنیع سے کلیجہ بھی چھلنی کیا کہ ''لو چکھو مزے۔میرے گھر کی دہلیز اکھاڑ دی تھی تم لوگوں نے کہ بس مہر تو شیر پر ہی لگانی ہے۔'' میں اور میرا خاندان انقلابی سا۔کہیں کسی درز سے، کسی ننھے منے شگاف سے روشنی کی کوئی چھوٹی سی کرن نظر آجائے تو بس امیدوں کے پہاڑ کھڑے کرنا تو معمولی بات ہے۔دس گھر دائیں اور دس گھر بائیں بھی حمایتی تقریریں شروع کر دیتی ہوں۔

پھر ہاتھ ذرا ہولا رکھا کہ چھوٹے ہیں۔ادب و احترام کے عادی ہیں۔پلٹ کر جو یہ طعنہ مار دیا کہ وہ آپ کے انقلابی کو بھی دیکھ رہے ہیں جو کچھ وہ کر رہا ہے۔ اُسنے اِن سے بھی بدتر ثابت ہونا تھا۔تو پھر پلّے کیا رہ جانا تھا۔

''ہائے'' بڑی لمبی سانس بھری تھی۔کہیں کوئی ایسا مرد آہن نظر نہیں آرہا ہے۔باہر نکلی تھی۔خدا کا شکر تھا کہ قدرت ان بے ڈھبوں اور بے سمتے لوگوں پر مہربان تھی۔پوہ کا مہینہ ہمیشہ کی طرح دھندوں، کہروں اور بادلوں کی زد میں نہیں تھا۔آسمان نتھرا، سُورج روشن

اور چمکدار تھا۔ماش کے آٹے کی طرح اکڑا ہوا جسم اسکی ممتا بھری نرم گرم اور ملائم سی گود میں مکھن کی طرح پگھلنے لگا تھا۔تھوڑی سی آسودگی محسوس ہوئی تو جی چاہا اٹھوں باہر نکلوں یہ جو ڈپریشن سا سوار ہے اس کو دفع دور کر کے آؤں۔

لونگ کوٹ پہنا۔جیب میں تھوڑے سے سکّے ڈالے۔ڈرائیور کو نہیں لیا کہ ایک تو چھٹی پر گاؤں گیا ہوا تھا۔اور دوسرا ایسا چرب زبان اور بونگا سا ہے کہ مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔جمعہ جمعہ اٹھ دن کی پیدائش اور اٹھ ہی دن ہوئے ہیں لاہور آئے ہوئے اور مجھے بتاتا ہے کہ اِس سڑک سے کٹ ماروں تو وہاں۔اس سے ماروں تو وہاں۔میں نے بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا کہ برخودار میں اگر لاہور کی جم نہیں تو پَل ضرور ہوں۔لاہور پرانا نیا اس کا کوئی گوشہ مجھ سے چھپا نہیں۔چار بار ترجمانے کروا کے ذرا راستے پر آیا لگتا ہے۔

میں تو لنڈے کیلئے نکلی تھی کہ چلو ذرا دل پشوری کروں۔کوئی نادر نایاب شے نظر آجائے پر جانے جین مندر کے پاس پہنچ کر مجھے میٹرو کی اور ہیڈ بل کھاتی سڑک اپنے گھماؤ اور ہیر پھیر سے اتنی خوبصورت نظر آئی کہ مجھے لگا جیسے میں کسی باہر کے ملک میں ہوں۔

''ارے میں نے تو اپنے ملک کی میٹرو کو تو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔اسکا جھولا تو لوں۔دیکھوں تو سہی کیسی ہے؟ رکشے کو رکوایا۔اور میٹرو کے ایسکیلیٹر پر چڑھی۔بیس روپے میں جو ٹوکن ملا اُسے خود کار مشین سے مَس کرتے ہوئے راستے کو کھولا۔میرے سامنے شیشے اور آئرن سٹیل کی لمبی دیوار اور کوریڈور تھا جس پر بوڑھے، بچے لڑکیاں، خواتین اور مرد چلتے تھے۔جگہ جگہ چوبی بینچ دھرے تھے۔میں ایک پر بیٹھ گئی اور لوگوں کو دیکھنے لگی۔یہ عوام تھی۔عوام یعنی نچلے متوسط اور غریب لوگ۔کالجوں کی لڑکیاں، مزدور کارکن خواتین چھوٹے موٹے صنعتی یونٹوں میں کام کرتی ہاتھوں میں پکڑے سموسے کھاتی باتیں کرتی چلی آتی تھیں۔میرے دل نے

جیسے خوشی سے کلکاری سی بھری۔ کتنا خوبصورت منظر ہے یہ بالکل باہر

کے ملکوں جیسا۔ میں نے چند لمحوں کیلئے ڈار کی ڈالروں کی شعبدہ بازیوں کو بُھلا دیا۔ ’’بس بے‘‘ جیسے لفظوں نے جو جگہ جگہ لٹکے ہوئے تھے استنبول کی یاد دلائی تھی۔ استنبول تو خیر ویسے ہی اس پر چڑھتے ہی یاد آ رہا تھا۔ تبھی سرخ رنگ کی بس ایک میٹھی سی اناؤنسمنٹ کے ساتھ وارد ہوئی۔ لوگوں نے فی الفور دروازوں کے سامنے قطاریں بنائیں۔ میں نے جھانکا۔ بہت رش تھا سواریاں کھڑی تھیں۔

’’مجھے کون سا کہیں حاضری دینی ہے۔ جانے دو۔ چند منٹ بعد دوسری پھر تیسری چوتھی۔ اسی طرح ہاؤس فل نظر آتا تھا۔‘‘

’’چلو بھئی اب جو آئے گی اسمیں سوار ہونا ہے۔ ڈرائیور کو دیکھا۔ پینٹ کوٹ ٹائی پہنے تمکنت سے بیٹھا تھا۔ جی خوش ہوا۔ سبک رفتاری سے بس چلی تو لگا جیسے جہاز میں بیٹھی ہوں۔ پر جہاز کا منظر بھی ایسی دل ربائی والا نہیں ہوتا۔ لاہور کی سڑکیں اُن پر چلتی بھرپور ٹریفک، سڑکوں کی بغلوں سے نکلتی گلیاں، ان کے گھر، لوگوں کی چلت پھرت، گھروں کی چھتیں۔ سٹیشن آتے لوگ اترتے نئے چڑھتے۔ مگر رش تھا کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میرا ارادہ تو کجومتہ تک جانے کا تھا۔ مگر کینال اسٹیشن پر اتر گئی کہ سیٹ کا ملنا محال نظر آ رہا تھا۔ اُترنے کی ایسکلیٹر زنہیں تھیں۔ وحدت روڈ کے چوک پر جنگلوں کے حصار سے باہر نکلنے کیلئے ایک بار پھر انڈر گرانڈ راستے پر جانا پڑا۔ یہ راستہ بھی اچھا لگا۔

چھوٹے میاں جی چلیں اگر آپ نے گیس کو اپنے واقف کار ٹیکسٹائل والوں کو دے کر ہماری گیس کو بند کر دیا ہے تو ہم اسے برداشت کرتے ہیں کہ معیشت کا پہیہ رواں ہونا ضروری ہے اس سے بھی تو لوگوں کے چولہے جلتے ہیں۔ چاہے اندر لکڑیاں ہی جلیں۔

آپ نے انرجی سیکٹر کو گیس دی ہے کہ ان کے پاس فرنس آئل خریدنے کیلئے پیسہ نہیں۔ میرا چولھا ٹھنڈا ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہائیڈل پاور میں بھی کمی آجاتی ہے اور میری بتی جلنے بجھنے لگتی ہے تو خیر صلا۔

ہم آپ کے اگلے منصوبے کا انتظار کرتے ہیں۔ اُن روسی خواتین کی طرح جن سے بیگم اختر ریاض الدین احمد ساٹھ کی دہائی میں اپنی روسی یاترا کے دوران ملی تھیں۔ سفارت کاروں کی بیویوں کے خوش رنگ جوتے اور کلرفل کپڑے دیکھ کر روسی عورتیں حسرت سے کہتیں۔ ’’اگلے پانچ سالہ منصوبے میں ہمارا وہ پروجیکٹ مکمل ہو جائے گا اور اس سے اگلے پانچ سالوں میں فلاں تو تب ہمیں بھی یہ چیزیں نصیب ہونگی۔ اور 2009 میں جب میں ماسکو گئی اور میں نے روسی عورت کو دیکھا وہ سرخی غازے سے لپی پتی جدید وضع کے جوتے اور ماڈرن لباس پہنے ہشاش بشاش سرگرمی سے کہیں پبلک جگہوں پر، کہیں پبلک ٹوائلٹوں، کہیں سڑکوں پر پوچے لگانے میں بُجتی ہوئی تھی۔

اُسے یہ سب بہت سالوں کے بعد ملا تھا تو چھوٹے میاں جی میں بھی انتظار کروں گی اس وقت کا کہ جب میری بتی ہمیشہ جلتی رہے اور میرا چولہا ہمیشہ گرم رہے۔

05-01-2014 پاکستان

لمحہ فکریہ

دنیا کو تباہ کرنے والے سائنسدانوں کے پچھتاوے

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

دو دن پہلے کی ایک خبر خاصی بڑی سرخی کے ساتھ اخبار میں درج تھی۔

کلاشنکوف رائفل کے موجد میخائل کلاشنکوف اپنی موت سے پہلے اپنی ایجاد پر سخت شرمندہ اور متاسف تھے۔اُن کا کہنا تھا کہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک ایسی خوفناک چیز بنائیں گے جو پلک جھپکتے میں ڈھیروں ڈھیر انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دے گی۔

اپنی موت سے کوئی چھ ماہ قبل ماسکو کے آرتھوڈوکس چرچ کے سربراہ کو ایک خط لکھتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے دنیا کو کیا دیا ہے۔اُن کی اس ایجاد سے نشانہ بننے والی ہر موت کی ذمہ داری انہیں اپنے کندھوں پر محسوس ہوتی ہے۔یہ خط جب لکھا گیا وہ اُس وقت 94 سال کے ہو رہے تھے۔دسمبر 2013 میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

یہ خبر بہت پہلوؤں سے فکر انگیز ہے۔فارسی کا ایک شعر بے اختیار یاد آرہا ہے۔شاید والی بات ہے کہ سعدی کا ہے۔

در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری　　وقت پیری گرگ ظالم مے شود پرہیز گار۔

کاش جوانی میں ان عالی دماغ سائنسدانوں سے کوئی پوچھے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اس وقت کنٹرول کیوں نہیں کرتے کہ پچھتاوے کی آگ میں جلنے سے بچ سکیں۔انسانیت کا تخم مار کر اُسکے منہ پر کالک مل کر وہ جو کچھ دنیا کو دیتے ہیں۔کیا وہ کسی طور بھی قابل فخر اور باعث طمانیت ہے؟پھول سے بچوں کے کٹے پھٹے اعضاء،جوانوں کی خوابوں سے بھری کھلی ساکت آنکھیں،معصوم عورتوں اور بوڑھوں کے لاشے،تباہ حال زمین،چرند پرند نباتات اُف کتنی خوفناک صورتیں سامنے آتی ہیں۔

آئن سٹائن کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ہیروشیما کے واقعے کے بعد وہ پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہا۔اپنے ایک انٹرویو میں اُس نے برملا کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انسانیت اتنی تباہ اور برباد ہوگی تو میں کبھی امریکہ کو اپنی ایجاد نہ دیتا۔میں بہت پچھتاوں کے ساتھ قبر میں اُتروں گا۔"

ہمارے سامنے ایک اور مثال ہائیڈروجن بم کے روسی موجد جناب سخاروف کی ہے۔اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی بہت ہی المناک ہے اور پھر جیسے انہوں نے اپنے اندرونی دُکھ اور ضمیر کے کچوکوں کا سامنا کیا اور اس کے اظہار کیلئے جیسے سینہ سپر ہوئے اس کا تعلق بھی جاننے سے ہے۔

ماسکو یونیورسٹی سے طبعیات میں گریجوایشن کرنے کے بعد وہ ایک بہت بڑی اسلحہ ساز فیکٹری میں کام کرنے لگے۔جناب ایگورتام نے جنہیں بعد میں نوبل انعام ملا ہائیڈروجن بم تیار کرنے والی ٹیم میں انہیں بھی شامل کرلیا۔

سخاروف نے اِس بم کی تیاری میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔جلد ہی وہ بہت اہم منصب پر فائز ہو گئے اور بہت زیادہ مراعات بھی حاصل کرلیں۔

1953 میں انہیں سائنسز اکیڈیمی کا رکن بنایا گیا۔32 سال کی عمر میں یہ اُن کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ اتنی نوعمری میں یہ اعزاز کسی کو نہیں ملا تھا۔

مگر ہوا یہ کہ اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ بہت غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ضمیر کی چبھن جب بڑھنے لگی تو انہوں نے کہا کہ ذہین اور فطین سائنس دانوں کو اسلحہ ساز کارخانوں میں نہیں لگانا چاہیے اور حکمرانوں کو ملک کی دولت تخریب کی بجائے تعمیر پر خرچ کرنی چاہیے۔

اسی پر اکتفا نہ ہوا۔خروشیف کا زمانہ تھا۔انہوں نے وزیر اعظم سے پرزور انداز میں کہا کہ وہ ایٹمی ٹیسٹ بند کردیں۔اب ان کے اور حکومتی عہدا ران میں

ایک چپقلش شروع ہوگئی۔ کہاں تو وہ ہائیڈروجن بم کے موجد کی حثیت سے وہ بہت محترم تھے یا اب وہ متنازعہ بن گئے۔ حکومتی ذرائع نے انہیں سخت تنبیہ کی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں اور روسی پالیسی میں دخل اندازی نہ کریں۔

لیکن وہ اپنے موقف میں پختہ تر ہوتے گئے۔ 1967 کی اسرائیل عرب جنگ کیلئے خود روس کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ اُسے ایک موثر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ 1968 میں انہوں نے روس امریکہ ڈائیلاگ پر زور دیا۔

1973 میں حکومت نے انہیں تنبیہ کی کہ جس قسم کے بیانات وہ میڈیا کو دے رہے ہیں وہ قانون کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتے ہیں اور جب روس 1979 میں افغانستان میں مداخلت کر رہا تھا انہوں نے اپنے ملک پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اُسے ایسے پنگوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اُنکے تمام اعزازات والقابات سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ماسکو سے 400 میل دور گورکی کے شہر میں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔

ان کی صحت خراب تھی۔ سخاروف کی بیوی باہر جانا چاہتی تھی۔ اس کی انہیں اجازت نہیں مل رہی تھی۔

اُن کا ایک ہی مطالبہ تھا ایٹمی ٹیسٹ بند کیے جائیں۔ تابکار مادے کے پھیلاؤ کو روکا جائے۔ فوجی طاقت اور اسلحے کی دوڑ کو ختم کیا جائے۔ لوگوں کو آزادی دی جائے۔ ملکوں میں امن ہو۔ پریس آزاد ہو۔ آزاد شہریوں کی رائے عامہ ہی حکومت کو موثر کنٹرول کر سکتی ہے۔

بدلتے وقت کے ساتھ روسی حکومے نے بہرحال اُن کے بہت سے مطالبات مانے۔ انہیں نوبل ایوارڈ فار پیس بھی دیا گیا تو اگر دنیا کے باقی سائنسدان بھی کچھ ایسی ہی روش اپنائیں تو اُن کا دنیا پر کتنا بڑا احسان ہوگا۔ کاش یہ mass destruction weapon بنانے والے کبھی اپنے کارناموں کو جو بستے رستے گھروں پر سکولوں کو جاتے وہاں پڑھتے پھولوں جیسے بچوں پر، کھیتوں میں کام کرنے والے معصوم انسانوں پر جو دنیا کی سیاست بازیوں سے لاعلم ہوتے ہیں پر کیسے کیسے وحشیانہ انداز میں حملہ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں جہاں وہ زندگی جیسی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں تو کبھی کٹے پھٹے اعضاء کے ساتھ نمونۂ عبرت بنتے ہیں۔

بغداد کے ہسپتالوں میں میں نے جو المناک منظر دیکھے تھے کاش کبھی وہ لوگ بھی یہ سب دیکھ لیں تو شاید کہیں سویا ہوا ضمیر بیدار ہو جائے۔ بغداد کی خلیفہ سٹریٹ پر ایک سبزی فروش جس سے امریکیوں کے کچن کیلئے سامان جاتا تھا نے ٹماٹر اور آلو تولتے ہوئے ان کے کچن سپروائزر سے بظاہر ہنستے ہوئے کہا تھا۔ یہ ٹماٹر اور آلو بصرہ سے آئے ہیں۔ یہ بصرہ کی اسی سرزمین کی پیداوار ہیں جسے تمہاری فوجوں کی بم شیلنگ نے زہر آلود کر دیا ہے۔ کھلاؤ انہیں تاکہ انہیں بھی کینسر ہوں۔ شاید تب یہ جانیں کہ ان کی عیار حکومتوں نے ہماری نئی نسلوں
کو کیسے تباہ و برباد کر دیا ہے۔

کاش دنیا امن کا گہوارہ ہو جائے۔ مگر کیا ایسا ممکن ہے؟ نہیں کبھی نہیں۔ انسان کی ہوس نے تو دھرتی جو صرف اور صرف اللہ کی ملکیت ہے کو بلاوجہ ٹکڑوں میں بانٹ لیا ہے اور بانٹ کر بھی نہ تو مطمئن ہے اور نہ اُسے چین ہے۔ کاش اِسے چین نصیب ہوتا۔

18-01-2014 پاکستان

لمحہ فکریہ

ذرا میرے ساتھ چلیئے نا

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

کوئی بیس 20 دنوں کی چلہ کشی کے بعد اُٹھی۔ چلو سفر نامہ عراق کا کوئی ہاتھ پیر تو سیدھا ہوا تھا۔ اب چہرے کے جھائیں، کھائیاں، چپ چپ نکلتے رہیں گے۔ ڈرائیور پوتوں، پوتی، نواسی، نواسوں کو لینے نکل رہا تھا۔ ساتھ بیٹھ گئی کہ چلو ذرا میری بھی ہوا خوری ہو جائے گی۔ چوک پر رُکے۔ یہ تو ہے نا کہ جب سے شہر کی صفائی ستھرائی کا ٹھیکہ بی ایم سی ٹُرک کمپنی کو دیا ہے۔ شہر کے اکثر حصّوں کی صورت ذرا بہتر نظر آتی ہے۔

ٹریفک سگنل پر رکے۔ گاڑیوں کا اژدہام تھا۔ اِسی اثنا میں ایک بے حد چمچماتی سیاہ ری بورن نے پاس آکر بریکیں لگائیں۔ ناکوں ناک بھری گاڑی کی عقبی سیٹ پر بیٹھے نوجوان لڑکے نے کینو کے چھلکے شیشہ نیچے کرتے ہوئے سڑک پر یوں پھینکے جیسے پنڈ کی کسی بارات پر ہو چھے سے چاچے مامے سکّے پھینکتے ہیں۔ ''ہائے'' میرے دل سے نکلا۔ سڑک صاف چمکدار اور اطراف میں اُگے پیلے پھولوں کی بہار ماحول کو کتنا خوبصورت بنا رہی ہے؟ اِس اندھے کو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ ہتھ چھٹ منہ پھٹ اس عورت سے تو ضبط نہ ہوا۔ دروازہ کھول فوراً چھلکے اٹھا اُس گاڑی والے لڑکے کو دیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ تو خیال کرو۔ ماحول کی خوبصورتی تمہیں کوئی پیغام دے رہی ہے۔ اِسے سُنو تو سہی۔''

شکر خدا کا لڑکا بھی اچھا ہی تھا کہ وہ چھلکے پلٹ کر میرے منہ پر مارنے کی بجائے ہاتھوں میں پکڑ لیے اور شرمندہ سا ہو گیا۔ اردگرد بیٹھے گاڑیوں والے نے جو تاثر آنکھوں کے راستے دیئے وہ کچھ ایسے ہی تھے جیسے کہتے ہو۔ عجیب سی سرپھری عورت ہے۔ ایک دو سے تو یہ تاثر بھی ملا۔ بڑی آئی ریفارمر۔

پر جب واپس مڑتی تھی تو پرلی طرف کھڑے رکشے کا دروازہ کھلا اور اندر بیٹھے ایک مرد نے گلے سے بلغم کا بڑا سا بزاق (تھوک) سڑک پر پھینکا اور ہرا ریکسین کا دروازہ بند ہو گیا۔ ڈرائیور کی سیٹ کے راستے مجھے اُس کا چہرہ نظر آتا تھا۔

میرے اندر کی استانی پوری طرح جاگ چکی تھی۔ بیس سال ہوتے ہیں یہی سبق اپنے سکول کے بچوں کو پڑھا رہی ہوں کہ انہوں نے کاغذ کے ٹکڑے اور تھوک زمین پر نہیں پھینکنا۔ میں نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اک ذرا اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''نہ ہوئی گھرپی میرے ہاتھ میں وگرنہ یہی غلیظ مادہ زمین سے اٹھا کر تمہارے چہرے پر پھینکتی۔ کم بختو منہ سے نکال کر گال پر ذرا لگاؤ پھر دیکھو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ یہ سڑکیں بھی تمہارا چہرہ ہیں۔ ان پر گند پھینکتے ہو تو اس کا چہرہ بدنما نہیں لگتا۔'' واپس آکر سیٹ پر کیا بیٹھی۔ ایک یلغار تھی۔ سُرخی پاؤڈر میں لپے پتے چہرے والیوں کی آنکھیں مکارا سے بھری ہوئی۔ تمسخرانہ انداز میں ہاتھ پھیلائے ہوئے۔ لہجے میں دھونس سی۔ فقیروں کی ایک نئی قسم۔

مجھے ہنسی آئی۔ اِن کی کسر رہ گئی تھی۔ مانگنے والوں نے بھی کتنے نئے نئے انداز اپنا لیے ہیں۔

کلمہ چوک ڈائیو کی ورکشاپ سے ملحقہ سکول کی برانچ کے سامنے سڑک کے درمیانی فٹ پاتھ پر خوانچہ فروشوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ چپس تلے جا رہے تھے۔ قلفیاں بک رہی تھیں۔ لچھے والے کا ڈنڈا سب سے اوپر تھا۔ بچوں کا ایک ہجوم چپس والے کے گرد کھڑا تھا۔ گرما گرم چپس۔ اوپر سے مصالحے اور سُرخ چٹنی کا چھڑکاؤ۔

گھر کا لنچ اور ابلے پانی کی بوتل بچے کو دینے اور ساتھ ہی باہر کی چیزیں نہ کھانے کی تاکید کرنے والی مائیں تو آنکھ اوجھل تھیں۔ بچے تو گرما گرم چٹخارے دار چپس کھاتے ہوئے یہ تھوڑی سوچ رہے تھے کہ تیل کیسا ہے اور چٹنی میں جو چیزیں استعمال ہوئی وہ ناقص تو نہیں۔ یہ تو بنانے والے کا دین ایمان ہے کہ وہ بچوں کی صحت

سے کھیل رہا ہے یا اپنی روزی کو حلال کر رہا ہے۔

اپنا بچپن یاد آرہا ہے ایسا ہی چیزوں کو کھانے کا ہا بڑا پڑا رہتا تھا۔ پر وہ زمانے بڑے اچھے تھے۔ نہ ماؤں کو کوئی فکر فاقہ تھا اور نہ چیزیں بیچنے والوں کو پیسے بنانے کا ہوکا تھا۔ ہر چیز خالص اور اچھی ہوتی تھی۔

بڑے پوتے کو سکول سے لینے میں ابھی تھوڑا وقت تھا میں الحمرا چلی گئی۔ وہاں آرٹ فیسٹیول ہو رہا تھا۔ سکول مدعو تھے۔ معاشرے کی دو انتہا ہیں۔ ایک بہت بڑے انگلش میڈیم سکول کے بچے اور گورنمنٹ سکول کی بچیاں۔

ہائے صدقے۔ بعض بچیوں کے پاؤں میں بوٹوں کی بجائے چپلیں تھیں۔ کاش ذریعہ تعلیم ایک ہوتا۔ کاش نصاب ایک ہوتا۔ گو اب گورنمنٹ سکولوں میں بھی انگلش میڈیم شروع تو ہو گیا ہے مگر اب معیار کا کیا کیا جائے۔

مگر ایک بات ضرور تھی۔ میں نے ان بچوں کی چال ڈھال میں جو اعتماد اور چہرے پر بھی "میں جو ہوں ٹھیک ہوں" جیسے تاثر کی فراوانی محسوس کی تھی۔ اور مجھے بہت خوشی محسوس ہوئی تھی۔

گھر آئی تو ٹی وی سکرین پر مذاکرات کے سلسلے میں زور و شور سے بحث و مباحثے ہو رہے تھے۔

"اللہ کرے یہ کامیاب ہو جائیں۔ جس کی امید بہت کم ہے۔ اگر کہیں اتفاق رائے ہو گیا تو شریعت کے نفاذ کا پھڈا نہ پڑ جائے۔ حکومت کا تو کہنا ہے کہ 1973 کا آئین عین اسلامی آئین ہے۔ اب اُن کی شریعت کون سی ہو گی؟ اور کس کی ہو گی؟ یہ بھی سوچنے والی بات ہے۔ ہمیں تو امن کی ضرورت ہے۔ سکون کی۔ بچے باہر جائیں تو ماں کی جان سولی پہ نہ ٹنگے۔

عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی جو بھی اقلیتیں یہاں ہیں وہ سکھ شانتی محسوس کریں۔

1950 اور 1960 کا لاہور ہو۔ ویسا ہی جیسا الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ہوتا تھا بس اُسکی واپسی چاہتے ہیں۔

13-02-2014 پاکستان

لمحہ فکریہ

محبت و تحسین کے پھولوں کی بارش میں بھیگتا اظہر جاوید

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

قومیں جب روبہ زوال ہوتی ہیں ۔انحطاط پذیری کا عمل اُن کی اخلاقی قدروں کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہوتا ہے تو اجتماعی شعور کی بھی ریخت گی شروع ہوجاتی ہے۔ نفسا نفسی کا عالم اور مادیت کی ڈور میں ایک دوسرے کی اکھاڑ پچھاڑ صاحب ادارک لوگوں کو حیران و پریشان کردیتی ہے۔

پاکستان سے محبت، حق سچ کا علم اٹھانے ،لفظ اور اس کی حرمت کی نگہبانی کرنے اور زندگی کو پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں کھڑے کسی مسافر کی طرح گزارنے والے لوگ تو اب کہیں خال خال کسی دانے کی طرح ہیں جو ڈھیرے ڈھیرے رزق خاک ہورہے ہیں۔ہم انہیں خراج پیش نہیں کرتے ۔پرنٹ میڈیا میں دو کالمی خبروں میں جگہ نہیں دیتے۔الیکٹرونک میڈیا پر ذکر نہیں کرتے ۔یہ کیسی بے حسی کا دور ہے۔

اظہر جاوید بھی ایسا ہی ایک درویش منش انسان ۔اردو ادب کی محبت میں گندھا ہوا ایک نسل کی پنیری تیار کرکے اُنہیں تن آور درختوں کی صورت ڈھالتا آناً فاناً ہنستا مسکراتا دنیا سے چلا گیا۔

یقیناً یہ اُسکی نیکیوں کا کوئی ثمر ہی ہوگا کہ تخلیق جیسے ادبی پرچے کو اپنے خونِ جگر سے چالیس سال تک سینچتے ہوئے اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ اُس کے بعد اُس کا اکلوتا بیٹا سُنان اُس کی ادبی محبت کو یوں سنبھال لے گا کہ اُس کے سارے دوستوں اور مہربانوں کو ایک چھت تلے اکٹھے کرے گا اور "تخلیق" نئی شان سے اپنے سفر پر چل نکلے گا۔

تو ذکر ہے اُس سہ پہر کا جب ادبی بیٹھک میں ملک کے نامور ادیب اُسے خراج پیش کرتے تھے۔جنھیں اکٹھا کرنے کا سہرا سنان،اعزاز احمد آذر اور افتخار مجاز کے سر پر تھا۔افتخار مجاز اپنی ریٹائرمنٹ پر بہت خوش ہیں اور ادبی محاذ پر پوری تندہی سے مصروف عمل ہوگئے ہیں۔

جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب باوجود یہ کہ وہ اب بہت کم باہر نکلتے ہیں ادبی بیٹھک کی دس بارہ سیڑھیاں چڑھ کر تشریف لائے اور آخری وقت تک تقریب میں رہے کچھ ایسا ہی معاملہ جناب فخر زمان صاحب کے ساتھ تھا کہ وہ آشوب چشمی مبتلا ہونے کے باوجود تشریف لائے اور یہ عزم رکھتے ہیں کہ اعزاز اور دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر اُن ادیبوں کی یادیں زندہ کریں گے جو دنیا سے چلے گئے ہیں اور جنہیں بھلا دیا گیا ہے۔

یہ ایک بہت بھرپور محفل تھی۔حسین مجروح کی خوبصورت گفتگو اُس کی یادوں،اُس کی ادبی خدمات اور تخلیق کے بارے کہ سنان نے جس ذہانت سے پرچے کو نئے رنگ و آہنگ سے سجایا ہے کے حوالوں سے ہوئی۔

سرفراز سید نے اظہر جاوید کی انسانی دوستی پر روشنی ڈالتے ہوئے امروز میں اُن دنوں کا قصہ سنایا جب انہیں برطرف کردیا گیا تھا اور اظہر جاوید نے کہا تھا ۔"شاہ جی آپ نے گھر بات نہیں کرنی ۔آپ نے معمول کے مطابق تیار ہو کر میرے پاس آجانا ہے۔باقی رہی تنخواہ اُس کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔بس فکر نہیں کرنا۔"

یہ دلا سا تسلی کے یہ بول ایک ایسے شخص کی طرف سے تھے جو خود درویش منش تھا۔مگر یہی وہ کردار تھا جو زندہ رہ گیا ہے۔

اعزاز احمد آذر نے تخلیق کے آغاز سے اظہر جاوید کی آخری سانسوں تک جدوجہد اور ادیبوں شاعروں کی ایک پوری کھیپ تیار کرنے پر تفصیلی بات کی۔پہلے پرچے سے ہی اُن کی تخلیق سے جس وابستگی کا آغاز ہوا وہ آج تک قائم ہے۔کیسا بے لوث انسان تھا۔کبھی کاغذ کی مہنگائی کا رونا نہ روتا۔کبھی مالی وسائل کی تنگی کا ذکر نہ

کرتا۔ بس پرچہ نکالے چلا جاتا۔ بیس روپے فی پرچے کی قیمت سے آگے نہیں جاتا تھا۔ پچاس روپے قیمت اُس وقت کی گئی جب مستنصر حسین تارڑ نے دھمکی دی کہ اگر قیمت نہیں بڑھاؤ گے تو میں پرچہ وصول نہیں کروں گا۔ مجھے بیس روپے کا پرچہ دیکھ کر شرمندگی ہوتی ہے۔ اعزاز نے زور دیتے ہوئے کہا میری خواہش ہے کہ آج کے دن یہ عہد کیا جائے کہ اُسے مرحوم نہ لکھا جائے نہ کہا جائے۔ وہ زندہ ہے۔ تخلیق کی صورت میں ہمارے درمیان ہے اور مجھے تو اکثر ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ ٹہلتا ٹہلتا کہیں سے نمودار ہو گا اور مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھے گا۔ اور کہے گا "جیو اعزاز محفل تو تم لوٹتے ہو"

وہ محبت سے بھرا ہوا آدمی تھا۔ اور دیکھیں دنیا سے رخصت بھی ہوا تو کس دن جس روز محبت کرنے والے ایک دوسرے کو سندیسے بھیجتے ہیں۔ سُرخ پھولوں کے تحفے دیتے اور محبت کی باتیں کرتے ہیں۔

پرائڈ آف پرفارمنس کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے فخر زمان نے بتایا کہ اس کی نامزدگی پر اعتراضات کی ایک لام ڈور تھی۔ مگر ہمارے سامنے اس کی وہ طویل جدوجہد تھی جو اُس نے آمریت کے خلاف کی۔ اس کی اپنے موقف پر کھڑے ہونے کی استقامت تھی جسے ہم سب نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس کے گواہ تھے۔ میں نے اعتراضات کو پرکاہ برابر اہمیت نہیں دی تھی۔ اُس کی خدمات کا اعتراف کرنا ہمارے لیے بے حد ضروری تھا اور ہم نے یہ کیا۔ تخلیق کو دیکھ کر مجھے سنان ایک پر عزم اور جوش و جذبے سے معمور نوجوان محسوس ہوا ہے۔ تخلیق کو مزید نکھارنے کی ضرورت ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس میں مقامی زبانوں کی کچھ نمائندگی ہو۔ اردو زبان کا دامن مقامی زبانوں کے تال میل سے بھرنا بہت ضروری ہے۔ اس میں اس کی بقا اور ملک کے ہر حصّے سے اس کی دل سے قبولیت Acceptance کا راز پوشیدہ ہے۔ عالمی ادب سے منتخب شاعری اور نثر کیلئے بھی چند صفحات مخصوص کیے جائیں۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے کہ عام لکھنے اور پڑھنے والا عالمی رجحانات سے آگاہ ہو۔

کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار ڈاکٹر انور سدید نے کیا جنھوں نے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے کہا کہ میرا اور تخلیق کا ساتھ زمانوں پرانا ہے۔ میں نے اظہر جاوید کو رسالے کا مدیر ہونے کے باوجود خود کو نمایاں کرنے اور اپنے پرچے میں چھپنے سے فراری دیکھا۔ وہ دوسروں کو آگے کرنے کا عادی تھا۔ اپنی ذات کی پروموشن اُسے پسند ہی نہ تھی۔ کچھ باتیں شفیع عقیل صاحب کے حوالے سے بھی ہوئیں۔

اُس شام جب بادل گرجتے اور بارش برستی تھی اور موسم بے حد خوبصورت تھا اُسے خراج پیش کیا جا رہا تھا محبتوں کے بولوں میں لدے پھندے تحفے اُسے بھیجے جا رہے تھے اور وہ یقیناً آسمان کی وسعتوں سے جھانکتے ہوئے مسکرا رہا ہو گا۔

پاکستان 20-02-2014

لمحہ فکریہ

روس اپنی بحالی کی طرف

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

تو کیا اب وقت نے روس کے دروازے پر دستک دے دی ہے کہ وہ یوکرائن کے معاملے پر اپنی ایک واضح اور دو ٹوک پالیسی سے دنیا کی اس طاقت کے غرور اور نشے میں بدمست اکلوتی سپر پاور کی اکڑی گردن کو جھٹکا دے کر ثابت کر سکے کہ کوئی ہے جو اُسے من مانی کاروائیوں سے روک سکتا ہے۔ ویسے تاریخ کے کھیل بھی کتنے دلچسپ اور سبق آموز ہیں اگر ہم سبق سیکھنا چاہیں تو۔

سال 1962 کا تھا اور دور کینیڈی اور خروشیف کا۔ جان ایف کینیڈی کا کہنا تھا سوویت یونین کیوبا میں نیوکلیر میزائلوں کی تنصیب بند کرے وگرنہ جنگ ناگزیر ہوگی۔ کیوبا امریکہ سے پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ گویا اس وقت دنیا کی دوسری پاور پہلی پاور کے گھر کے دروازے پر میزائلوں کی باڑ لگا رہی تھی۔

گویا نصف صدی بعد تاریخ کو دہرایا جا رہا ہے۔ یوکرائن کی سرحدیں روس کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ سوویت کے دنوں میں اُس کا ایک حصّہ تھا۔ معیشتوں کا انحصار بھی ایک دوسرے سے منسلک تھا۔ روس اور روسی زبان بولنے والوں اور سمجھنے والوں کی بھی کثیر تعداد یوکرائن میں آباد۔ بلکہ اُس کا ایک حصّہ کریمیا تو روسی ہی سمجھیے۔ اب ایسے میں ایک دوسرے پر بہت سے معاملات میں انحصار خاصا بڑھ جاتا ہے۔

امریکہ کو بھی چین نہیں ابھی دنیا میں پہلے سے اُس کے پھیلائے ہوئے پنگوں جنہوں نے بہت سی قوموں کو لہولہان کیا ہوا ہے۔ ان کے زخموں سے خون بہہ رہا ہے اور وہ ہے کہ ایک اور محاذ کھولنے کو تیار نظر آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یورپی اقوام ساتھ دیتی نظر نہیں آتیں کہ جرمن سمیت ان کے مفادات روس سے وابستہ ہیں۔ یوکرائنی صدر وکٹر یانوکووچ اس وقت روس میں ہے۔ اور روس پوری طرح مستعد نظر آتا ہے کہ امریکہ کو بھرپور جواب دیا جائے۔ سچی بات ہے امریکہ کی بدمعاشیاں بھی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ کوئی نظر ہی نہیں آتا کہ جو اسکا ہاتھ پکڑ کر اُسے ذرا لگام ڈالے۔ شام کے مسئلے پر روس کے سٹینڈ نے ایک امید افزا صورت کو جنم دیا ہے۔ روس بھی جانتا ہے کہ اُسے اب یوکرائن پر قبضہ نہیں کرنا صرف امریکہ کے اثر و نفوذ اور مداخلت کا توڑ کرنا ہے۔

یورپی یونین کا تھانیدار یورپی یونین کو پابندیوں کیلئے اگر کہتا ہے تو اِس کہنے میں اثر کتنا ہوگا؟ ہندوستان جیسے ملک نے واضح لفظوں میں کہا ہے کہ وہ امریکہ کے کسی ایسے فیصلے میں شامل نہیں ہوگا جو روس سے متعلق ہوگا پابندیوں کے متعلق وہ امریکہ کا ہمنوا نہیں ہوگا۔ اب پاکستان پر بھی یہ واضح ہونا چاہیے کہ روس اُس کا ہمسایہ ہے اور اُسے اِن بدلتے حالات میں امریکی اثر و نفوذ سے تھوڑا باہر آنا چاہیے۔

ایک اور اہم واقعے پر بھی قارئین سے کچھ شیئر کرنا ہے جو انتہائی تکلیف دہ ہے۔ اور ہمارے ذہنی شعور کی نفی کرتا ہے۔ کچھ عرصے سے مرکزی شاہراہوں پر ایک بل بورڈ گا ہے گاہے نظر آتا ہے۔ کشمیر کو آزاد کروانے کیلئے ہندو کی مرمت کرنی ضروری ہے۔ یہ رویہ سطحی سوچ کا مظہر ہے۔ ایسے بیانات تضحیک کا باعث بنتے ہیں۔ اپنے ملک کو دیکھیے کیا خون خرابے ہو رہے ہیں۔ یہاں تو ایک خدا اور ایک قرآن کو ماننے والے متحد نہیں وہ ایک دوسرے کا سر پھاڑ رہے ہیں۔ ایک نظریے ایک مسلک کا حامی دوسرے کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں۔ رواداری برداشت انسانیت کا احترام جیسی اقدار اِس معاشرے سے ختم ہوگئی ہیں۔ مسجدیں محفوظ نہیں۔ کلمہ گو کلمہ گو کا گلا کاٹ رہا ہے اور آپ باتیں کرتے ہیں ہندو کی مرمت کی۔ خدا کیلئے ہوش کریں۔ سنجیدہ اور عقل والی باتیں کریں۔

تھر کے قحط نے دل گرفتہ کیا۔ یہ صورت حال کیوں ہوئی؟ کس سے پوچھا جائے۔ سندھ حکومت اس کا کیا جواب دے گی؟ بات تو وہی ہے کہ حکمرانوں کی ترجیحات میں تو عوام تو کہیں ہیں ہی نہیں۔

اب قحط کا یہ قافلہ چولستان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سچی بات دل دہل رہا ہے کہ خدا چولستان کو اس سے محفوظ رکھے۔ بہر حال ایک اطمینان تو ہے کہ پنجاب حکومت کا سربراہ لاپرواہ نہیں۔ ذمہ دار بھی ہے اور مستعد بھی۔ خود پہنچ کر صورت حال کو درست کرے گا۔ مگر بات تو ہے کہ یہ صورت حال جنم کیوں لے۔ وقت سے پہلے اسکا تدارک کیوں نہیں ہوتا۔ ذمہ دار افراد انتظامیہ افسران کی لام ڈور آخر کس مرض کی دوا ہے جو یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے علاقے میں کوئی ناگہانی صورت پیدا ہونے والی ہے۔ کوئی بھی آفت ایکا ایکی تو نہیں آتی۔ اُسے آتے آتے بھی وقت لگتا ہے۔

اب ایک اور درخواست ارباب اقتدار کی خدمت میں کہ بہت توانا لہجے کا شاعر جناب کرامت حسین بخاری ایک ایمان دار، ذمہ دار، فرض شناس افسر جسکی پیشہ ورانہ زندگی کرپشن کے داغ دھبوں سے پاک صاف ہے۔ آڈٹ اینڈ اکاونٹس میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز اِس انسان پر پرموشن کے دروازے کیوں بند ہیں؟ بار بار ٹرانسفر کے کیا معنی ہیں؟ کیا سبق سکھانا چاہتی ہے انتظامیہ اُسے۔ تنخواہ کی بندش، ذہنی اذیت ہم آخر کس طرف جا رہے ہیں۔ آخر یہاں زیادتی کرنے والوں کو کوئی ڈر خوف کیوں نہیں۔ قانون گھر کی لونڈی کیوں بنا بیٹھا ہے۔ مجھے اُس بوڑھے کی بپتا یاد آ رہی ہے جس کی ایک دوکان ڈی ایچ اے کے مین بلیو وارڈ میں ہے۔ اس کا کرایہ دار اُسے ناک چنے چبوا رہا ہے۔ وہ درخواست لیکر ڈی ایچ اے آفس جاتا ہے وہاں سنوائی نہیں کہ یہ دوکانیں ان کی حدود میں نہیں وہ کہتا ہے۔ میں کس عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاوں۔ کہاں جاوں اب ہم جب باہر کے ملکوں کی مثالیں دیتے ہیں تو ہمیں کہا جاتا ہے کہ یہ ملک کے وفادار نہیں۔ یہ وفاداری ہم میں کیسے آئے گی۔ کیا ہوائیں پھانک کر۔ کیا دُکھ درد اور ذہنی اذیت سہہ کر۔ قانون کے ہاتھ کیوں مضبوط نہیں کیے جاتے۔ عام آدمی کو یہ تحفظ اور اطمینان کب نصیب ہوگا کہ وہ عدالت کے دروازے پر دستک دے گا تو اُسے انصاف ملے گا۔

پاکستان 25-03-2014

لمحہ فکریہ

باتیں کچھ دل کی کچھ دُنیا کی

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

سچی بات ہے نہ اخبار پڑھنے کو دل کرتا ہے نہ ٹی وی دیکھنے کو۔ایک ایسی بھونڈی مار دھاڑ ہوئی پڑی ہے کہ سمجھ نہیں آتی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔کون کسے چت کرنا چاہتا ہے؟ ٹی وی چینلوں کو جیسے کُھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔کاروباری رقابتیں اِس آڑ میں کُھل کر سامنے آ گئی ہیں۔ایک دوسرے کا بیڑہ غرق کرنے کی سرتوڑ کوششیں ہو رہی ہیں اینکر پرسنز کی چیختی چنگاڑتی آوازیں اور ٹاک شوز ایک دوسرے کو پاتال میں دھکیلنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔اخلاقیات کا تو بیڑہ ہو گیا لگتا ہے۔ حامد میر جیسے دلیر اور بے باک صحافی کو خدا صحت اور تندرستی دے۔ارباب اختیار کو عقل و شعور دے کہ معاملات کو احسن طریق سے نپٹائیں۔محاذ آرائی کی کیفیات کو تدبر اور سلیقے سے حل کریں۔فوج اور سول دونوں کو جاننا چاہیے کہ ملک کی سلامتی اور وقار اسی میں مضمر ہے کہ کوئی بھی احتساب سے بالاتر نہ ہو۔خُدا کرے قانون اتنا طاقتور ہو جائے کہ اس کے ڈنڈے سے سب ڈرتے رہیں

گذشتہ دنوں شہر میں کتابوں کے حوالوں سے بہت سی تقریبات ہوئی ہیں۔ادارہ بیاض کی طرف سے فرحت پروین کے نئے مجموعے ''بزم شیشہ گراں'' کی تقریب جسمیں ڈاکٹر شہریار نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔

عمران خان کی طرح ڈاکٹر شہریار کینسر سپیشلسٹ ایک ایسا اسپتال بنانے پر تلے ہوئے ہیں جہاں ہر غریب اور اس بیماری کے شکار افراد کا علاج ہو سکے۔ان کے ساتھ بہت سے ڈاکٹروں کی ٹیم ہے۔جوان اور باہمت لوگ جن کے جذبے قابل ستائش ہیں۔فرحت
پروین اس بہت بڑے کام میں نہ صرف اُن کی مدّاح ہے بلکہ انکے پینل کی ایک فعال رکن بھی ہے۔جانی اور مالی ہر طرح کے تعاون پر مائل ہے اور دوسرے لوگوں کو مائل کرنے پر سرگرم ہے۔

فرحت پروین لکھاریوں اور ادیبوں کے ساتھ متعدد تقریبات منعقد کر چکی ہے۔جہاں ڈاکٹر شہریار، ڈاکٹر شاہینہ آصف اور دیگر ڈاکٹروں نے تفصیلی اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے ادیبوں اور دانشوروں کا تعاون مانگا ہے۔اُن سے التجا کی ہے کہ وہ اس عظیم کام میں اُن کا ہاتھ بٹائیں۔فرحت پروین کے افسانوں کے حوالوں سے جب ڈاکٹر شہریار نے گفتگو کی تو سامعین حیران رہ گئے کہ ایک کینسر سپیشلسٹ ڈاکٹر اتنے اعلیٰ ادبی ذوق کا حامل ہے۔وہ تحریر کے اندر جھانک کر کیسے اتنا خوبصورت تجزیہ کر رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ فرحت کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔دراصل وہ مختلف سرزمینوں کی باسی ہے۔دنیا میں گھومتی پھرتی ہے۔رنگا رنگ کرداروں سے ملتی ہے۔انسانی زندگی اور رویوں کے بے شمار عکس اُسے نظر آتے ہیں۔جنہیں لفظوں کے پیراھن پہنا کر وہ قارئین کو سونپتی ہے۔''بزم شیشہ گراں'' اُسکا نیا افسانوی مجموعہ ہے اور سابقہ مجموعوں کی طرح کمال کا ہے۔اس کے رنگ و آہنگ میں نئے اضافے ہیں۔اسلوب میں نئی جدتیں ہیں۔کہانیاں ٹیچ ٹرز ہیں۔ایک لکھنے والے کی بڑی خوبی اور کامیابی یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو گرفت میں لے لے۔فرحت کے ہاں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ چابک دستی سے قاری کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ورق پلٹے۔اُس کی ایک کہانی ایسی نہیں جس نے کسی بڑے معاشرتی ایشو کو نہ کھولا ہو۔یہ کہانیاں انسانی رشتوں کی کہانیاں ہیں۔عورت کے اندر کی کہانیاں ہیں۔

ہمارے اردگرد اتنی مایوسیاں پھیلی ہوئی ہیں کہ جب اپنی قوم کا کوئی روشن رُخ سامنے آتا ہے تو چند لمحوں کیلئے یقین ہی نہیں آتا کہ اللہ ہمارے ہاں بھی ایسے لوگ ہیں جو یہ سنہری روایات بو رہے ہیں۔جی چاہتا ہے کہ نیشنل ہائی وے پولیس کے سربراہ کو سلیوٹ ماروں۔انہیں بھرپور خراج عقیدت پیش کروں۔ فیصل آباد کی تحصیل سمندری میں کسی عزیز کی عیادت کے لیے جانا پڑا۔راستہ اوکاڑہ کا لیا۔پتوکی سے ذرا آگے ٹریفک وارڈن نے ڈرائیور کو رکنے کا سگنل دیا۔گاڑی آگے جا کر رک

گئی اور ڈرائیور اُتر کرانکی جانب گیا کہ روکنے کی وجہ معلوم کرے۔دس، پندرہ، بیس منٹ گزر گئے۔میں نے پریشانی سے سوچا کہ معلوم نہیں کیا بات ہے؟ابھی میں اُترنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ ٹریفک وارڈن نے گاڑی کے پاس آکر اترے شیشے سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا،

آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔اپنے ڈرائیور کو سمجھائیے کہ وہ چالان پرچی کٹوائے۔ہمیں دو سو روپیہ دے کر معاملہ رفع دفع کرنے کا کہہ رہا ہے۔ہم کسی قیمت پر ایسا نہیں کرتے۔ میرے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ڈرائیور پر شدید غصہ آیا۔کمبخت کے جیسے ہڈیوں میں بے ایمانی رچی ہوئی ہے۔جانتا بھی ہے پھر بھی باز نہیں آتا۔کھٹ سے دروازہ کھولا اور اُن کی طرف بھاگی، جہاں ڈرائیور انکے ساتھ معاملے کو غلط طور پر نپٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پہلے تو اُسکی توضیح کی۔وارڈن سے چالان کاٹنے کو کہا۔اور جب وہ میرے ہاتھ میں سات سو جرمانے کی رسید تھما رہا تھا۔میں نے کہا،

میرا جی چاہتا ہے میں آپ کو سلیوٹ ماروں۔یہ جرمانہ ادا کرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ میرے ملک میں ایسا ہونے لگا ہے۔جسکی خواہش ہماری تمنا رہی ہے۔اور مجھے ذرا بتا دیجئے کہ اِس سے کہاں غلطی ہوئی؟ تا کہ یہ دوبارہ اس غلطی کو نہ دہرائے۔

''شہری آبادی کے قریب رفتار کم رکھنی ضروری ہے بورڈوں پر نشان دہی کی گئی ہے۔اسکے مطابق ڈرائیونگ اور سپیڈ ہونی چاہیے''اُسنے متشکر نظروں سے مجھے دیکھا۔

لوڈشیڈنگ سے تو نپٹتے نپٹتے ہو بےحال ہو چکے ہیں۔ایک گھنٹہ آنے اور ایک گھنٹہ جانے کا شغل۔دن اسی آئی اور چلی گئی کا ورد کرتے گزرتا ہے۔اب اتنی ہمت حکومت میں نہیں کہ بجلی چور بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالے۔پکڑے اور انہیں ذبح کرے۔ایسے میں وزیروں کے سڑے بُسے بیانات اور جی کو جلاتے ہیں۔اُوپر سے پولیو کے قطروں کا ایشو۔خوب جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔لگتا ہے کہ جانے کن غاروں کے زمانوں میں یہ ہمیں دھکیلنے کیلئے مرے جا رہے ہیں۔

بھارت کے انتخابات بھی خاصی تشویش کا باعث بن رہے ہیں۔بھارتی جنتا پارٹی (بی جے پی) کی کامیابی اور نریندر مودی کا بطور وزیر اعظم بننے کی تگ و دو نے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کے بھی سنجیدہ مزاج حلقوں کو پریشان کر رکھا ہے۔حتمی نتائج تو مئی کے وسط تک سامنے آئیں گے۔پس دو چار روز کی ہی بات رہ گئی ہے۔مگر جو کچھ تو سامنے آگیا ہے۔وہ خاصا پریشان کن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خود بی جے پی کے اندر ایک کشمکش اور تناؤ کی سی کیفیت بڑھ ہی ہے کہ جتنے متوازن سوچ والے لوگ ہیں انہیں انتہا پسندوں نے پارٹی سے ہی نکال باہر کر دیا ہے۔کسی بھی پارٹی یا تنظیم میں جب آئیڈیالوجی اور کیڈر سسٹم کی جگہ شخصیتیں مرکز بن جائیں تو پھر کام ٹھیک نہیں رہتا۔بی جے پی بھی اسی راستے پر چل نکلی ہے۔نریندر مودی خود پسند اور مخالف بات سُننے کا روادار نہیں۔اعتدال پسند لوگ اب نا قابل برداشت ہو گئے ہیں۔

جسونت سنگھ تو آؤٹ ہو گئے ہیں۔سچ لکھنے کے جرم میں جناح کی تعریف لکھنے پر۔انہوں نے بھی پارٹی کے ایسے تنگ نظر رویوں پر اُسکے خوب خوب لتے لیے تو شرما شرمی

دوبارہ داخل دفتر کیے گئے مگر اب آزاد الیکشن لڑنے پھر توپوں کی زد میں آگئے ہیں۔

کاش انڈیا کے مسلمان تعلیمی فکری اور سماجی طور پر مضبوط ہوتے تو جسطرح باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نریندر مودی نے گجرات کے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ایسی شرمناک حرکت کرنے سے قبل وہ دس بار سوچتے۔ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ ایک بار بھی اس پر ندامت کا اظہار نہیں کیا۔کانگریس کا پھر ظرف ہے کہ اُسنے سکھ فسادات پر علانیہ معافی مانگی۔ہم جیسے پاکستانی تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ ملک کیلئے بہتریاں ہوں۔

افغانستان کی نئی قیادت کو خدا عقل وشعور دے کہ وہ پاکستان کی قربانیوں اور مسائل کو سمجھے اور ہندوستان کی گود میں گرنے سے قبل سوچے۔خدا ملکی لیڈروں اور اپوزیشن کو بھی سیدھا راستہ دکھائے۔عمران خان جس طرز عمل کا اظہار کر رہے ہیں۔اسپر بھی عام آدمی پریشان ہے۔وہ ساری امیدیں جو اسکی ذات سے وابستہ تھیں ،ڈوبتی نظر آتی ہیں۔

پاکستان 20-05-2014